

دارالمصنّفین شبلی اکیڈمی کا علمی و دینی ماہنامہ

محارف

جلد نمبر ۱۹۲	ماہ شوال المکرم ۱۴۳۴ھ مطابق ماہ اگست ۲۰۱۳ء	عدد ۲
مجلس ادارت	شذرات	۸۲
مولانا سید محمد رابع ندوی	مقالات	۸۵
لکھنؤ	عربی میں علم ہیئت کا آغاز و ارتقاء عہد مامون تک	
پروفیسر ریاض الرحمن خاں شروانی	فکر اسلامی کی نشاۃ ثانیہ اور علامہ اقبال	۱۰۰
علی گڑھ	ڈاکٹر سید عبدالباری	۱۱۸
	مولانا شبلی کے فارسی خطوط	
	جناب ساجد صدیق نظامی	۱۳۱
	قاضی محبت اللہ بہاری (م ۱۱۱۹ھ)	
	جناب طلحہ نعت ندوی	۱۴۴
(مرتبہ)	اخبار علمیہ	
اشتقاق احمد ظلی	ک، ص اصلاحی	
محمد عمیر الصدیق ندوی	معارف کی ڈاک	۱۴۷
	قاطع برہان بہ خط غالب	
	جناب انوار صدیقی امر وہوی	
	صدی تقریب	۱۵۰
دارالمصنّفین شبلی اکیڈمی	جناب وارث ریاضی	۱۵۲
	راجہ رتن سنگھ زحّی اور قصیدہ ہفت بند.....	
پوسٹ بکس نمبر: ۱۹	جناب بابر نسیم آسی	۱۵۳
شبلی روڈ، اعظم گڑھ (یو پی)	جہان شبلی	
پن کوڈ: ۲۷۶۰۰۱	جناب شمس بدایونی	۱۵۴
	صدی تقریب	
	جناب عتیق الرحمن	۱۵۵
	”نقوش رفتہ“	
	جناب شاہد عمادی	
	ادبیات	۱۵۶
	آؤ دعا کریں	
	جناب فاخر جلال پوری	
	مطبوعات جدیدہ	۱۵۷
	ع-ص	
	رسید کتب	۱۶۰

شذرات

مصر میں فوجی بغاوت اور ملک کے پہلے منتخب صدر کی معزولی اور گرفتاری پر ایک مہینہ کا عرصہ گزر چکا ہے۔ اب اخوان اور اس کا سیاسی بازو ممنوع ہے، اس کے متعدد رہنما گرفتار، اثاثے منجمد اور دفاتر سیل کر دیے گئے ہیں۔ ان کے اخبارات اور ٹی۔وی اسٹیشن بند کر دیے گئے ہیں۔ جو دستور ایک واضح اکثریت سے منظور کیا گیا تھا اسے کالعدم قرار دے دیا گیا ہے۔ جو لوگ الکشن میں ناکام رہے انہوں نے فوج کے کندھے پر سوار ہو کر ایوان اقتدار تک پہنچنے کا مختصر راستہ تلاش کر لیا ہے۔ معزول صدر اور اخوان کے خلاف الزامات کی ایک طویل فہرست ہے۔ ان میں سے بعض میں کسی قدر صداقت بھی ہے۔ لیکن واقعہ یہ ہے کہ انہیں اپنی کمیوں اور کوتاہیوں کی وجہ سے یہ سزا نہیں دی گئی بلکہ اس کی اصل وجہ وہ اچھائیاں اور خوبیاں ہیں جن کے لیے یہ جماعت جانی اور پچانی جاتی رہی ہے اور جن کی حفاظت کے لیے اس نے اپنی طویل تاریخ میں بڑی قربانیاں دی ہیں۔ شدید مخالفت اور مسلسل ظلم و ستم کا نشانہ بنے رہنے کے باوجود انہی کی وجہ سے اسے مصری معاشرہ میں یہ قبول عام حاصل ہوا۔ اس مقبولیت کا سب سے واضح ثبوت یہ ہے کہ گزشتہ دو سال کے عرصہ میں مصری عوام کو چھ مرتبہ اپنی پسند اور ناپسند کے اظہار کا موقع ملا۔ اس میں پارلیمنٹ کے لیے الکشن، صدارتی الکشن اور دستور کی منظور کے لیے ریفرنڈم شامل ہے۔ بغیر کسی استثناء کے ہر مرتبہ مصری عوام نے اس کی پالیسیوں کی بھرپور توثیق کی اور پارلیمنٹ میں اسے بھاری اکثریت سے کامیاب کیا۔ واقعہ یہ ہے کہ اخوان کی کامیابی کو مغربی طاقتوں اور ان کے مصری ہم نواؤں نے دل سے کبھی قبول نہیں کیا۔ الگ الگ اسباب کی وجہ سے کئی عرب ممالک کے لیے بھی یہ صورت حال قابل قبول نہیں تھی۔ دستور کی اسلامی اساس، اس میں اہانت رسول پر سزا کی دفعہ، فلسطینیوں کی معاشی ناکہ بندی ختم کرنے کے لیے رخ کر اسنگ کھولنے کا فیصلہ، اسرائیل کے ساتھ تعلقات میں تحفظات کا اظہار، ایران کے ساتھ تعلقات کی بحالی کی ابتداء، مغرب کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بات کرنے کی جرأت، مری کے جرائم کی فہرست بہت طویل ہے۔ ایک ایسے حساس خطے میں جس سے امریکہ اور یورپ کے غیر معمولی مفادات وابستہ ہیں اور جس سے اسرائیل کی بقا اور سلامتی کا مسئلہ جڑا ہوا ہے، وہاں اخوان جیسی جماعت کی بالادستی گوارا نہیں کی جاسکتی۔ فوجی بغاوت کی نسبت سے اب جو تفصیلات سامنے آرہی ہیں ان سے واضح طور پر یہ بات ثابت ہو جاتی ہے کہ مری کو ہٹانے کے لیے پہلے دن ہی سے تیاریاں شروع ہو گئی تھیں۔ کیلیفورنیا یونیورسٹی، برکلی کے ایک تحقیقاتی ادارے نے ناقابل تردید شواہد کی بنیاد پر یہ ثابت کر دیا ہے کہ امریکہ نے Democracy Assistance Initiative کے پروگرام کے تحت مری مخالفین کو بڑے پیمانے پر مالی امداد فراہم کی۔ یہی وجہ ہے کہ امریکہ اور یورپ مصر کے اس خونیں انقلاب کو فوجی بغاوت تسلیم کرنے سے گریزاں ہیں۔ ترک حکومت کی طرف سے گیزی پارک مظاہرین کے خلاف آنسو گیس کے استعمال پر آنسو بہانے والی حکومتیں اور دن رات ان کی خبریں نشر کرنے والے مغربی ذرائع ابلاغ فوج کے ہاتھوں مری کے نہتے حامیوں کے قتل عام پر مہربلب ہیں۔ پیغام واضح ہے۔ مسلم ممالک میں جمہوریت کے ذریعہ تبدیلی کی اجازت نہیں دی جائے گی۔ الجزائر، فلسطین اور اب مصر اس کا

ثبوت ہے۔ اس سے انتہا پسندوں کا موقف مضبوط ہوا ہے جو اس بات پر یقین رکھتے ہیں کہ مسلم ممالک میں جمہوریت کے ذریعہ کوئی تبدیلی نہیں لائی جاسکتی۔ اس کا صرف ایک راستہ ہے مسلح جدوجہد۔

گذشتہ کئی دہوں سے مصر میں اصل طاقت فوج کے ہاتھ میں رہی ہے۔ مصر کی جدید تاریخ کے تمام ڈکٹیٹر فوجی پس منظر رکھتے ہیں۔ گذشتہ ایک سال کے دوران جب بظاہر زمام اقتدار مرسى کے ہاتھ میں تھی، اس وقت بھی طاقت کا اصل سرچشمہ فوج ہی تھی۔ مرسى کے ہاتھوں اعلیٰ فوجی سربراہوں کی برطرفی اور عبدالفتاح السیسی کے تقرر سے یہ تاثر ضرور ملتا تھا کہ اب فوج سویلین حکومت کے قابو میں آگئی ہے لیکن حقیقت واقعہ سے اس کا کوئی تعلق نہیں تھا۔ اس دام ہمرنگ زمین سے بہتوں نے دھوکہ کھایا۔ صدر مرسى اور اخوان کے لیے یہ تاثر بہت مہنگا پڑا۔ واقعہ یہ ہے کہ فیصلہ کن طاقت اب بھی فوج کے ہاتھ میں تھی۔ بدلے ہوئے حالات کے تحت منظر نامہ میں تھوڑی سی تبدیلی کر دی گئی تھی۔ جنرل سیسی امریکہ کے تربیت یافتہ ہیں اور مصری فوج کی روایت کے مطابق امریکہ اور اسرائیل سے ان کے مراسم نہایت گہرے ہیں چنانچہ امریکی اور اسرائیلی مفادات کی پاسداری کے معاملہ میں ان سے کسی سمجھوتہ کی توقع نہیں کی جاسکتی۔ یہ صدر مرسى اور اخوان کی سادہ لوحی اور ناتجربہ کاری تھی کہ انہوں نے فوج پر آنکھ بند کر کے بھروسہ کر لیا اور آخر تک جنرل سیسی کی وفاداری کی یقین دہانیوں پر بھروسہ کرتے رہے۔ ان کے پاس شاید اس کا کوئی متبادل بھی نہیں تھا۔ ۳۰ رجون کے مظاہرے جنہیں فوج نے مداخلت کے لیے جواز کے طور پر استعمال کیا طے شدہ منصوبہ کے مطابق تھے۔ تحریر اسکوائر میں جمع ہونے والے مظاہرہ نہیں کر رہے تھے بلکہ مصر میں ابھرتی ہوئی جمہوریت کے قتل کا جشن منا رہے تھے۔ اس جشن میں فوج برابر کی شریک تھی اور فضائیہ کے طیارے اپنے کرتب سے مجمع کا جی بھلا رہے تھے۔ تحریر اسکوائر میں مظاہرہ کرنے والوں کی تعداد پانچ سے آٹھ ملین تک بتائی گئی۔ دعویٰ کیا گیا کہ پورے مصر میں ۳۳ ملین افراد نے مرسى کے خلاف مظاہروں میں شرکت کی۔ چونکہ یہ مظاہرے ایک منصوبہ کے تحت منعقد کیے گئے تھے اور انہیں فوجی مداخلت کے لیے بہانہ کے طور پر استعمال کیا جانا تھا اس لیے دنیا نے اسے بے چون و چرا تسلیم کر لیا اور زمینی حقائق کی روشنی میں اسے جانچنے پر کھنے کی ضرورت نہیں سمجھی گئی اور اسے انسانی تاریخ کا سب سے بڑا مظاہرہ قرار دیا گیا۔ اب جو معروضی تجزیے سامنے آ رہے ہیں ان سے یہ ثابت ہو گیا ہے کہ یہ تاریخ انسانی کا ایک بہت بڑا فراڈ تھا۔ واقعہ یہ ہے کہ تحریر اسکوائر اور وہاں تک آنے والی سڑکوں پر مجموعی طور پر چار لاکھ سے زیادہ لوگوں کی سمائی ممکن نہیں۔ اندازہ ہے کہ اسی قدر لوگ مصر کے دوسرے شہروں میں ہونے والے مظاہروں میں شریک ہوئے۔ کہاں آٹھ لاکھ اور کہاں ۳۳ ملین۔ سب سے زیادہ آبادی والے عرب ملک میں آٹھ لاکھ افراد مملکت کے طول و عرض میں حکومت وقت کے خلاف مظاہرہ کرتے ہیں اور فوج یہ نتیجہ نکالتی ہے کہ مصری قوم نے اپنی منشا اور خواہش کو واضح طور پر ظاہر کر دیا ہے اور صدر کی معزولی اور حکومت کی برطرفی کے علاوہ اب کوئی اور چارہ کار باقی نہیں رہا۔ گذشتہ ایک مہینہ سے مصریوں کی ایک بڑی تعداد پورے ملک میں اس فیصلہ کے خلاف مظاہرہ کر رہی

ہے۔ مصری فوج کے نزدیک یہ عوام کی خواہش اور منشا کا اظہار نہیں ہے۔

مصر کے پیچیدہ سیاسی، معاشی اور انتظامی مسائل ماضی کا ورثہ تھے اور مختصر مدت میں ان کا حل ممکن نہیں تھا۔ مختلف اسباب کے باعث شاید ان مسائل کی طرف اتنی بنجیدگی سے توجہ بھی نہیں دی جاسکی جتنی ضرورت تھی۔ اس محاذ پر ناکامی کا ایک بڑا سبب یہ تھا کہ مرسى ایسے افراد اور اداروں سے گھرے ہوئے تھے جو ہر قیمت پر ان کو ناکام بنانا چاہتے تھے۔ فوج اور عدلیہ جن پر پرانے نظام کی اساس تھی اپنی جگہ موجود اور پوری طرح محفوظ تھے۔ یہ دونوں ادارے پرانے ظالمانہ اور کرپٹ نظام حکومت کی حفاظت کے مقصد سے تشکیل دیے گئے تھے۔ ان اداروں نے اصلاح احوال کی ہر کوشش کی مخالفت کی اور اس کی راہ میں روڑے اٹکائے۔ مرسى کو جو انتظامی ڈھانچہ ورثہ میں ملا تھا اور جس کے ذریعہ انہیں کاروبار حکومت چلانا تھا وہ حسنی مبارک کے تیس سالہ دور میں مخصوص مقاصد کے پیش نظر وضع کیا گیا تھا۔ اس کو بدلنے کے لیے جو وقت اور تجربہ درکار تھا وہ میسر نہیں تھا۔ اس نظام کو چلانے والوں کے پاس انتظام و انصرام حکومت کا طویل تجربہ تھا۔ حکومت کے کل پرزوں کو کس طرح کنٹرول کیا جاتا ہے یہ انہیں اچھی طرح معلوم تھا۔ اس میں کام کرنے والے تمام کارکن اسی کرپٹ اور بدعنوان حکومت کے سایے میں پلے بڑھے تھے۔ حکومت کے تمام کلیدی عہدوں پر ان کا قبضہ تھا اور ان کے مفادات کی حفاظت کے لیے عدلیہ موجود تھی۔ اس کے برخلاف اخوان کو حکومت چلانے کا کوئی سابقہ تجربہ نہیں تھا۔ چنانچہ نہایت کامیابی سے اصلاح احوال کی تمام کوششوں کو سبوتاژ کیا جاتا رہا۔ مثال کے طور پر یہاں بجلی اور گیس کی سپلائی کے سلسلہ میں پیدا ہونے والے شدید بحران کو پیش کیا جاسکتا ہے۔ اس سے عام شہریوں کی روزمرہ زندگی متاثر ہوئی اور مرسى کی حکمرانی کی اہلیت کے بارے میں منفی جذبات پروان چڑھے۔ جیسا کہ بعد میں ثابت ہوا یہ بحران سرتاسر خود ساختہ اور مصنوعی تھا۔ ملک میں نہ بجلی کی کمی تھی اور نہ گیس کی۔ چنانچہ مرسى حکومت کے اختتام کے اگلے ہی دن اس کی سپلائی معمول پر آگئی۔ یہ محض ایک مثال ہے ورنہ حسنی مبارک کے عہد کی باقیات نے کہاں کہاں اس طرح کا مصنوعی بحران پیدا کیا اس کا اندازہ کرنا بھی مشکل ہے۔ ان عناصر نے اپوزیشن کو بھی نہایت ہوشیاری سے اپنے مقاصد کے لیے استعمال کیا اور حکومت پر اپنی ڈھیلی پڑتی ہوئی گرفت کو پھر مضبوط کر لیا۔ اپوزیشن آج پوری طرح فوج کی آلہ کار بنی ہوئی ہے اور خوش ہے کہ اس کی مدد سے وہ مرسى کو ہٹانے میں کامیاب ہو گئی ہے۔ جمہوریت، آزادی رائے اور انسانی حقوق جن کی علم برداری کا ان کو دعویٰ تھا، اب انہیں وہ یکسر فراموش کر چکے ہیں۔ دوسری طرف انسانیت کا ایک جم غفیر ہے جو قافہ اور دوسرے شہروں میں شدید گرمی اور رمضان کے باوجود پوری پامردی سے میدان میں ڈٹا ہوا ہے۔ منتخب صدر کی واپسی کے علاوہ کوئی اور متبادل ان کے لیے قابل قبول نہیں۔ دھمکی، دباؤ اور غیر معمولی تشدد بھی ان کو وہاں سے ہٹانے میں کامیاب نہیں ہو سکا ہے۔ سینکڑوں جانوں کی قربانی کے باوجود بھی ان کے جوش اور جذبہ میں کوئی کمی نہیں۔ تاریخ گواہ ہے کہ ابتلا و آزمائش اخوان کے لیے کوئی نئی چیز نہیں۔ وہ اسی بھٹی میں تپ کر نکلے ہیں۔ ان کے عزم اور پامردی کو دیکھ کر یہ خیال ہوتا ہے کہ یہ ناکمل انقلاب شاید ان کے ہاتھوں اپنی تکمیل کو پہنچ جائے۔

مقالات

عربی میں علم ہیئت کا آغاز و ارتقاء عہد مامون تک پروفیسر مقصود احمد

عربوں کو ستاروں سے گومحدود حد تک ہی سہی، دور جاہلیت ہی سے دلچسپی رہی ہے۔ ان کے نکلنے اور ڈوبنے سے ان کو سمتوں کا اندازہ ہوتا تھا، بحر و بر کے سفروں میں رہنمائی حاصل ہوتی تھی اور رات میں وقت کے تعین میں بھی ان سے کافی حد تک مدد ملتی تھی۔ اہل عرب نے ستاروں کا علم کلدانیوں سے حاصل کیا تھا۔ ان سے متاثر ہو کر بعض قبائل عرب نے انسان کی زندگی پر ستاروں کے اثرات (Astral Influences) اور سعد و نحس کا عقیدہ بھی اختیار کر لیا تھا، یہاں تک کہ عطار، مشتری وغیرہ کی پرستش بھی کرنے لگے تھے۔

ظہور اسلام کے بعد مسلمان عربوں نے بھی ان ستاروں کو اپنی توجہ کا مرکز بنایا، مگر اس نمایاں امتیاز کے ساتھ کہ نہ تو انہوں نے کبھی ان کے اثرات نیک و بد پر اعتقاد رکھا اور نہ کبھی ان کی عبادت میں ملوث ہو کر عقیدہ توحید کو آلودہ کیا۔ انہوں نے ستاروں کا شمار ہمیشہ مخلوقات میں کیا اور ان کو انسان کے فائدے کے لیے خدائے واحد کی تخلیق کردہ قابل تسخیر اشیاء تصور کیا۔ چنانچہ رات کی نمازوں، سحری اور صبح صادق کے اوقات کے تعین اور سمت کعبہ معلوم کرنے کے سلسلے میں ان سے بڑا کام لیا گیا۔ علاوہ ازیں دور جاہلیت کے عربوں کی طرح، مسلمانوں نے بھی خشکی اور سمندر کے سفر میں ان کے ذریعے رہنمائی حاصل کی۔ رب ذوالمنن نے اس کی جانب قرآن حکیم میں درج ذیل الفاظ میں اشارہ فرمایا ہے:

وَهُوَ الَّذِي جَعَلَ لَكُمُ النُّجُومَ اور وہی ہے جس نے تمہارے لیے ستاروں کو

صدر، شعبہ فارسی، عربی و اردو، بڑودہ یونیورسٹی، بڑودہ ۳۹۰۰۰۲، گجرات۔

لَتَهْتَدُوا بِهَا فِي ظُلُمَاتِ الْبَرِّ پیدا کیا تاکہ تم ان کے ذریعے خشکی اور سمندر
وَالْبَحْرِ۔ (۹۸:۶) کے اندھیروں میں راستہ معلوم کر سکو۔

دوسری جگہ ستاروں کے ذریعہ راستہ معلوم کرنے کا ذکر ان الفاظ میں آیا ہے: وَبِالنَّجْمِ
هُمْ يَهْتَدُونَ۔ (۱۶:۱۶)

متعدد حدیثوں میں صلاۃ کسوف و خسوف کا ذکر آیا ہے جس سے پتہ چلتا ہے کہ سورج گہن
اور چاند گہن سے آگاہی عام تھی۔

خلافت راشدہ کے زمانے (۶۳۲ء-۶۶۰ء) میں بھی یہی صورت حال رہی۔ جہاں تک
اموی عہد (۶۶۰ء-۷۵۰ء) کا سوال ہے، اس میں علم ہیئت (Astronomy) (۱) سے زیادہ
علم نجوم (Astrology) (۲) کی جانب توجہ مبذول کی گئی۔ خلیفہ عبدالملک بن مروان (۶۸۵ء-
۷۰۵ء) کو نجوم پر اتنا اعتقاد تھا کہ اپنے خاص نجومی (Astrologer) کے مشورے کے بغیر وہ کوئی
کام نہیں کرتا تھا۔ اور اموی دور کے آخر میں تو یہ دلچسپی اپنی حد کو پہنچ گئی تھی، یہاں تک کہ خلفاء
اپنے زائچے (Tables) بنوانے لگے تھے، جیسا کہ ولید بن یزید (م ۷۴۴ء) کے حالات زندگی
میں آتا ہے۔ (۳)

خالد بن یزید (م ۸۵ھ/۷۰۴ء) کو بھی علم نجوم (Astrology) سے بڑی دلچسپی تھی۔
اس نے انفرادی طور پر مذکورہ علم سے متعلق بعض قبلی یا یونانی کتب یا رسائل کا ترجمہ بھی اپنے لیے
عربی میں کرایا تھا، جواب موجود نہیں ہیں۔ (۴)

جہاں تک عباسی خلفاء کا تعلق ہے، وہ تو نجومیوں کے مضحکہ خیز حد تک معتقد تھے اور ایک
طرح سے ان کو اپنا پیر تصور کرتے تھے۔ لیکن اس کے پہلو بہ پہلو، انہوں نے علم ہیئت (Astronomy)
کے فروغ کی جانب بھی خاطر خواہ توجہ دی۔ اس سلسلے میں خلیفہ منصور (۷۵۴ء-۷۷۵ء) نے جو
اہم سرپرستانہ کردار ادا کیا اسے فراموش نہیں کیا جاسکتا۔ وہ نجومیوں کو ہر وقت اپنے ساتھ رکھتا
تھا۔ ان میں سے ایک قابل ذکر نام نوبخت کا ہے۔ یہ اصلاً مجوسی تھا مگر بعد میں اس نے منصور کے
ہاتھ پر اسلام قبول کر لیا تھا۔ اس کے بعد اس کے بیٹے ابوسہل الفضل بن نوبخت (م تقریباً ۸۱۵ء)
کا نام آتا ہے۔

علم نجوم کے علاوہ منصور نے علم ہیئت کے فروغ کی جانب بھی خاطر خواہ توجہ مبذول کی، جس کی وجہ سے اجرام فلکی کے سائنسی مطالعہ کی راہ ہموار ہوئی۔ اس نے محمد بن ابراہیم الفزاری (م ۹۶ء - ۸۰۶ء) کو ہندوستانی ہیئت داں، برہم گپت (م ۶۶۰ء یا ۶۶۵ء) کی گراں قدر منظوم تصنیف ”برہم سہٹ سدھانت“ (۵) (Brahma-Sphuta-Siddhanta) کو سنسکرت سے عربی میں منتقل کرنے کا حکم دیا۔ اس نے حکم کی تعمیل کی اور ۷۷۷ء میں مذکورہ کتاب کا ترجمہ ”السند الہند“ کے عنوان سے کر کے اولین مسلم ہیئت داں ہونے کا قابل فخر اعزاز حاصل کیا (۶)۔ ظاہر ہے کہ یہ ترجمہ اس نے اس پنڈت کی مدد سے کیا ہوگا جو ہندوستان سے بغداد آیا تھا اور اپنے ساتھ مجملہ دیگر اشیاء کے ”سدھانت“ کا ایک نسخہ بھی لے آیا تھا (۷)۔ مامون کے زمانے تک اعمال کو اکب میں اسی ترجمے پر اعتماد کیا جاتا تھا۔

غالباً اسی زمانے میں محمد بن ابراہیم کے والد ابو اسحاق ابراہیم بن حبیب الفزاری (م ۷۷۷ء) نے پہلی بار ایک اصطرب (Astrolabe) تیار کیا اور اس طرح وہ اولین مسلم اصطرب ساز ہونے کی سعادت سے بہرہ مند ہوا۔ (۸)

مولانا سید سلیمان ندویؒ کی ایک صراحت سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ ابراہیم الفزاری نے بھی ”سدھانت“ کو اپنے طور سے عربی میں منتقل کیا تھا (۹)۔ علم ہیئت سے متعلق اس کی دیگر تصانیف کے نام یہ ہیں:

- ۱- کتاب القصیدہ فی علم النجوم - ۲- کتاب المقیاس للزوال -
- ۳- کتاب الزیج علی سنی العرب - ۴- کتاب العمل بالاسطرلاب (؟)۔
- ۵- کتاب العمل بالاسطرلاب المسطح - (۱۰)

علاوہ ازیں سید صاحبؒ ہی کی تصریح کے مطابق ابراہیم الفزاری کے ہم عصر یعقوب بن طارق نے بھی سدھانت کا ترجمہ عربی میں اپنے انداز میں کیا تھا (۱۱)۔ اس کے ساتھ ہی اس نے ۱۶ھ میں مذکورہ بالا پنڈت سے یا کسی اور آنے والے پنڈت سے ”الارکند“ یعنی کھنڈا کھڈیک (Khanda Khadyaka) کا طریقہ بھی سیکھا تھا (۱۲)۔ الارکند کا قدرے مفصل ذکر آگے آرہا ہے۔ علم ہیئت پر اس کی مشہور تصنیف کا نام ”ترکیب الافلاک“ (The Composition

(of the Spheres) ہے۔ البیرونی نے کتاب الہند میں کئی جگہ یعقوب کی اس تصنیف کے مشمولات کی تفصیل فراہم کی ہے اور اس کی تحقیقات کا تنقیدی جائزہ بھی لیا ہے (۱۳)۔ اس کی دوسری کتابوں کے نام حسب ذیل ہیں:

- ۱- کتاب تقطیع کردجات الجیب - ۲- کتاب ما ارتفع من قوس نصف النهار - ۳- کتاب الزیج محلول فی السند ہند لدرجۃ درجۃ - (یہ دو کتابیں ہیں پہلی علم الفلک پر ہے اور دوسری کا تعلق علم الدول سے ہے) - ۴- کتاب المقالات - (۱۴)

آخر الذکر ان خلفاء اور سلاطین کے زائچوں پر ہے جن کی تاریخ ہائے ولادت معلوم نہیں ہو سکیں (۱۵)۔ اس کا انتقال آٹھویں صدی عیسوی کے نصف آخر میں ۷۸۷ء کے بعد کبھی ہوا۔

اس ضمن میں مزید دو نام قابل ذکر ہیں یعنی ماشاء اللہ یہودی اور علی بن عیسیٰ الاصطربلابی۔ ابن ندیم نے اول الذکر کا نام ماشاء اللہ بن اشری لکھا ہے (دیکھیے کتاب الفہرست، ص ۳۳۳) لیکن قفطی نے غالباً ماشاء اللہ بن ابری تحریر کیا ہے۔ اس کے برعکس یعقوبی نے اس کو ماشاء اللہ بن ساریہ مرقوم کیا ہے (دیکھیے کتاب البلدان، ص ۲۳۸ بحوالہ طبقات الامم، اردو ترجمہ، ص ۱۰۴)۔ مگر ان سب میں ابن ندیم کی تحقیق زیادہ درست معلوم ہوتی ہے۔ ماشاء اللہ بنیشی خلیفہ منصور کے زمانے میں تھا اور مامون کے عہد تک زندہ رہا۔ اسے علم ہیئت اور علم نجوم میں مہارت حاصل تھی۔ یہ کئی کتابوں کا مصنف تھا، جن میں سے کچھ کے نام یہ ہیں۔ کتاب الموالید الکبیر، کتاب مطرح الشعاع، کتاب صنعة الاسطرلابات والعمل بها، کتاب ذات الحلق، کتاب الامطار والرياح، کتاب الموالید اور کتاب تحویل سنی الموالید - (۱۶) اس کی بعض کتابوں کے لاطینی ترجمے بھی شائع ہو چکے ہیں۔

علی بن عیسیٰ الاصطربلابی بھی منصور کے زمانے میں تھا اور اس کا انتقال مامون کے عہد میں ۸۳۰ء کے بعد کبھی ہوا۔ جیسا کہ اس کے نام سے ظاہر ہے یہ بھی اصطربلاب ساز تھا، اس نے اصطربلاب ضرور بنائے ہوں گے، مگر ان کی تفصیل دستیاب نہیں ہو سکی۔ اس کا ایک اہم کارنامہ یہ

ہے کہ اس نے غالباً مامون کے زمانے میں کسی نامعلوم سنہ میں اصطربلاب پر ایک رسالہ سپرد قلم کیا تھا، جس کا شمار آلہ مذکورہ پر تحریر کردہ چند ابتدائی تصانیف میں ہوتا ہے (۱۷)۔ اس کا ذکر آگے آئے گا۔

”سدھانت“ کے بعد آریہ بھٹ (Aryabhatta - ۴۷۶ء - ۵۵۰ء) (۱۸) کی تصنیف آریہ بھٹیہ (Arbhattiya) کا ترجمہ عربی میں ”الار جھد یا الار جھذ“ کے عنوان سے ہوا۔ اسے الار جھر اور الار جھر بھی لکھا جاتا ہے۔ اس کے مترجم کا نام ابوالحسن اہوازی تھا۔ (۱۹) خلیفہ منصور کے عہد میں عربی میں منتقل ہونے والی تیسری سنسکرت کتاب کا نام ”کھنڈا کھڈیک“ تھا۔ یہ ایک مختصر رسالہ ہے، جسے برہم گپت نے ”سدھانت“ کے بعد سپرد قلم کیا تھا۔ اس میں اس نے سدھانت سے جداگانہ اصول قائم کیے ہیں۔ اس کا عربی ترجمہ ”الار کند“ کے عنوان سے ہوا، جو البیرونی (م ۱۰۵۰/۵۱ء) کے زمانے تک موجود تھا۔ چونکہ یہ ترجمہ بہت مبہم اور مغلق تھا، اس لیے البیرونی نے اس کی اصلاح کر کے اس کا ایک نیا اور فصیح شدہ اڈیشن تیار کیا تھا۔ لیکن افسوس کہ اس وقت اس کا کوئی بھی قلمی نسخہ موجود نہیں ہے (۲۰)۔ اس کا نام کہیں کہیں ”الاهرقن“ بھی لکھا ہوا ملتا ہے۔

المسعودی (م ۹۵۷ء) کی صراحت سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ منصور کے زمانے میں بطلمیوس (Ptolemy) کی ”المجسطی“ (Almagest) کا ترجمہ بھی یونانی سے عربی میں ہوا (۲۱)۔ پروفیسر حطی نے بھی History of the Arabs (ص ۳۱۱) میں اس کا ذکر کیا ہے۔ اگر یہ صحیح ہے تو اس کا مطلب یہ ہوا کہ المجسطی کا اولین عربی ترجمہ خلیفہ منصور کے عہد ہی میں ہوا۔ مگر اس کو قبول عام حاصل نہیں ہو سکا، جس کا سبب لفظی ترجمے کی ناہمواری اور عبارات میں موجود ابہام و اغلاق ہو سکتا ہے۔

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ منصور کے بیٹے المہدی (۷۷۵ء - ۷۸۵ء) کے عہد میں علم ہیئت کے فروغ کی جانب خاطر خواہ توجہ نہیں دی گئی۔ اگرچہ اس کے عہد میں بھی نامور ہیئت داں موجود تھے اور ہو سکتا ہے کہ انہوں نے اپنے طور پر اس سلسلے میں کچھ کارنامے بھی انجام دیے ہوں، مگر حکومتی سطح پر ان کی ہمت افزائی کی کوئی مثال نظر سے نہیں گزری۔ مہدی کی تمام تر توجہ ملحدین

کی سرکوبی کی جانب رہی اور ابتداء میں سینکڑوں ہزاروں لوگوں کو کیفر کردار تک پہنچانے کے بعد بھی جب اسے بے لگام آزاد خیالی اور الحاد کے فتنے کو روکنے میں ناکامی ہوئی تو اس نے اس کو بالآخر علمی تلوار سے فرو کرنے کا فیصلہ کیا۔ چنانچہ اس نے علمائے اسلام کو ملحدین کے رد میں کتابیں تصنیف کرنے کا حکم دیا۔ اس کی وجہ سے ایک نئے علم کی بنیاد پڑی جو علم کلام کہلاتا ہے اور اس نے الحاد و زندقہ کے سیلاب کو روکنے میں اہم رول ادا کیا۔ مختصر یہ کہ مہدی کے دور میں دیگر علوم و فنون کے مقابلے میں علم کلام کو مرکزی حیثیت حاصل رہی۔

مہدی کے بعد الہادی تخت نشین ہوا۔ چونکہ اس کا عہد (۷۸۵ء-۷۸۶ء) بہت ہی مختصر تھا، اس لیے اس کو علوم و فنون کی ترویج و ترقی کی طرف توجہ مبذول کرنے کا زیادہ موقع نہیں ملا۔ اس کے عہد میں بھی علم کلام کی مرکزیت برقرار رہی۔ یہاں یہ بات بھی قابل ذکر ہے کہ مہدی کی طرح اسے بھی فتنہ الحاد کے سیلاب کو روکنے کے لیے بہت کچھ کرنا پڑا اور علوم ذیلہ کے فروغ کے سلسلے میں بھی پھونک پھونک کر قدم رکھنا پڑا، کیونکہ اس میں ذرا سی بھی بے احتیاطی اور غیر ضروری نرمی فساد عقیدہ کا سبب ہو سکتی تھی۔

ہادی کے جانشین، ہارون الرشید کے دور اقتدار (۷۸۶ء-۸۰۹ء) میں صورت حال میں نمایاں تبدیلی واقع ہوئی۔ اس کے زمانے میں علم ہیئت اور دیگر علوم کے ساتھ فلسفے کو بھی خاصا فروغ حاصل ہوا۔ اس نے فلسفے سے متعلق یونانی کتابوں کا عربی میں ترجمہ کرایا اور اس سلسلے میں اس نے یوحنا بن ماسویہ کی خدمات بطور خاص حاصل کیں۔ اس کے عہد تک دیگر زبانوں (یونانی، فارسی، سریانی اور ہندی) کی تصنیفات کا جو بھی ذخیرہ جمع ہو چکا تھا، اس نے اس کو محفوظ کرنے کے لیے ایک عالی شان ”بیت الحکمۃ“ قائم کیا۔ علاوہ ازیں اس کے عہد میں بر مکوں کی کوششوں کے طفیل، مناظرے کا بازار بھی گرم ہوا اور جگہ جگہ اس کی مجلسیں منعقد ہونے لگیں۔ جن میں ہر قوم اور ہر مذہب کے افراد شرکت کرتے تھے۔ لیکن فقہاء نے اس کی کھل کر مخالفت کی۔ شروع میں تو ہارون رشید نے ان کی مخالفت کو کوئی اہمیت نہیں دی، مگر اخیر زمانے میں اس کو اس کے سامنے گھٹنے ٹیکنے پر مجبور ہونا پڑا اور مناظرے کی مجلسوں پر پابندی عائد کرنی پڑی، جس کی وجہ سے فلسفے کا بازار سرد پڑ گیا۔

لیکن علم ہیئت سمیت دیگر علوم کی ترقی کا سلسلہ بدستور قائم رہا۔ ہارون رشید اور اس کے وزیر یحییٰ بن خالد برکی (م ۸۰۵ء) کو علم ہیئت سے خاصی دلچسپی تھی۔ اس وجہ سے ان دونوں نے اس کے فروغ کے سلسلے میں ہر ممکن کوشش کی۔ ہارون کے عہد میں یحییٰ برکی کے زیر اہتمام المجسطی کا عربی میں دوبارہ ترجمہ ہوا۔ ابن ندیم کی فراہم کردہ تفصیل سے معلوم ہوتا ہے کہ یحییٰ نے مذکورہ کتاب کے ترجمے پر ایک ساتھ کئی لوگوں کو مامور کیا۔ جب ان لوگوں نے اپنے اپنے ترجمے اس کے سامنے پیش کیے تو اس نے ان سب کو ناپسند کیا اور ابو حسان و سلمان کو ان کی اصلاح کرنے کا حکم دیا۔ چنانچہ ان دونوں نے بہت سے اعلیٰ درجے کے مترجمین کو جمع کیا اور ان کے ترجموں کا باہم موازنہ و مقابلہ کر کے ایک فصیح ترین اور صحیح ترین نسخے کا انتخاب کیا۔ (۲۲)

علاوہ ازیں ہارون کے عہد میں علم ہیئت سے متعلق کچھ پہلوی (فارسی) کی کتابیں بھی فضل بن نوبخت (م ۸۱۵ء) کے ذریعہ عربی میں منتقل ہوئیں۔ اسی زمانے میں ابو الحسن علی بن زیاد التمیمی نے شہریار کی زیچ (معروف بہ زیک شتر وایار Royal Astronomical Tables) کا ترجمہ ”زیچ الشہریار“ یا ”زیچ الشاہ“ کے عنوان سے عربی میں کیا۔ (۲۳)

حسن بن سہل اور سہل بن بشر بن ہائی بھی عہد ہارونی کے مشہور ہیئت دانوں میں ہیں۔ اول الذکر نے علم الانواء (۲۴) پر ”کتاب الانواء“ کے عنوان سے ایک کتاب تصنیف کی۔ ثانی الذکر نے کئی کتابیں سپرد قلم کیں، جن میں سے بعض یہ ہیں: کتاب الہیئۃ و علم الحساب، کتاب تحاویل سنی الموالید، کتاب تحویل سنی العالم، کتاب الاوقات، کتاب الامطار و الریاح، کتاب الکسوفات، کتاب المدخل الکبیر، کتاب المدخل الصغیر۔ (۲۵)

ان دونوں کے علاوہ فضل بن نوبخت نے بھی جس کا ذکر ابھی اوپر آچکا ہے، علم ہیئت پر کچھ کتابیں تالیف کیں، جن میں سے بعض کے نام یہ ہیں: کتاب النھمطان فی الموالید، کتاب الفال النجومی، کتاب الموالید، کتاب تحویل سنی الموالید، کتاب المدخل، کتاب المنتحل من اتاوایل المنجمین فی الاخبار و المسائل و الموالید۔ (۲۶)

علم ہیئت کی ترویج و ترقی میں ہارون کے بعد اس کے لائق فرزند، مامون (۸۱۳ء) نے کچھ ایسے بے مثال کارہائے نمایاں انجام دیے جو سنہرے حروف سے لکھے جانے

کے قابل ہیں۔ ایک تو یہ کہ بطلمیوس (Ptolemy، ۹۰ء-۱۶۸ء) کی المجسطی (Almagest) کا ترجمہ پھر عربی میں کرایا، جو عہد ہارونی کے ترجمے سے کہیں بہتر تھا۔ یہ فریضہ حجاج بن مطر نے ۲۸/۸۲۷ء میں انجام دیا۔ یہاں یہ بات بھی قابل ذکر ہے کہ آگے چل کر یعنی نویں صدی کے نصف آخر میں حنین بن اسحاق (م ۸۷۳ء) نے بھی اس کا ترجمہ عربی میں کیا، جس پر ثابت بن قرۃ (م ۹۰۱ء) نے نظر ثانی کی۔

دوسرے یہ کہ اس نے ابن خلف المروزی سے ذات الحلق اور اصطرلاب تیار کرایا، جو رصد میں کافی معاون ثابت ہوئے۔

تیسرے یہ کہ ستاروں کے مشاہدات سے متعلق چند یسپور میں جاری شدہ سرگرمیوں سے متاثر ہو کر اس نے ۲۱۴ھ میں بغداد میں بہ مقام شماسیہ اور اس کے بعد غالباً سنہ مذکور ہی میں دمشق میں بہ مقام قاسیون دو عظیم الشان رصدگاہیں (Astronomical observatories) قائم کیں اور قیمتی آلات رصد یہ مہیا کیے۔ اول الذکر میں مامون کے ہیئت دانوں نے سند بن علی اور یحییٰ بن ابی منصور (م ۸۳۰/۳۱ء) کے زیر نگرانی نہ صرف اجرام فلکی کی حرکات کا مشاہدہ کیا، بلکہ المجسطی کے بنیادی عناصر کا انتہائی باریک بینی سے تجزیہ کر کے ان کی تصدیق بھی کی اور اس کے بعد انہوں نے الزنج الممتحن (Verified Tables) کے عنوان سے ایک زیچ بھی تیار کی۔ اس زیچ کو قطعی شکل دینے سے پہلے مذکورہ ہیئت دانوں نے قاسیون (دمشق) میں بھی متعدد تجربات و مشاہدات کیے۔ مذکورہ دونوں ہیئت دانوں کے علاوہ خالد بن عبد الملک مروزی اور عباس بن سعید جوہری بھی شماسیہ کی رصدگاہ سے وابستہ تھے۔ ان دونوں نے بھی علم ہیئت کے فروغ میں کافی کچھ کیا۔ ان سب نے اجتماعی طور پر بیش قیمت آلات رصد یہ کی مدد سے آفتاب کے میل کا مقدار، اس کے مرکزوں کا خروج، اوج کے مواضع اور چند سیارات و ثوابت کے حالات دریافت کیے۔

قاسیون کی رصدگاہ سے جو ہیئت داں وابستہ تھے ان میں سناد، ابوالطیب اور ابن عیسیٰ کے اسمائے گرامی خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ علم ہیئت کی ترقی میں ان لوگوں نے بھی اپنے اپنے طور پر کافی خدمات انجام دیں۔

چوتھے یہ کہ اس نے اپنے عہد میں کرۂ ارض کی پیمائش کرائی، جسے اس کا ایک ناقابل فراموش کارنامہ قرار دیا جاسکتا ہے۔ اس پیمائش میں محمد، احمد اور حسن نے اہم کردار ادا کیا۔ علامہ شبلیؒ نے المامون میں ابن خلکان کی وفیات الاعیان (ترجمہ محمد بن موسیٰ) کے حوالے سے اس کا قدرے مفصل ذکر کیا ہے، جو کچھ یوں ہے:

” (مامون نے) محمد (م ۸۷۳ء)، احمد و حسن (فرزندان موسیٰ بن شاکر) کو جو اس کے خاص ندیم اور فنون و حکمت کی ترقی و اشاعت میں اس سے بھی کچھ زیادہ سرگرم تھے، حکم دیا کہ دربار میں جو ہیئت داں ماہرین فن ہیں، ان کو ساتھ لیں اور کسی ہموار اور وسیع صحرا میں آلات رصدیہ اور اصول حساب کے استعمال سے کرۂ زمین کی پیمائش کریں۔ سنجار (Sinjar) کا سطح اور وسیع میدان اس تجربے کے لیے نہایت مناسب مقام تھا۔ ان لوگوں نے پہلے ایک جگہ ٹھہر کر آلات رصدیہ کے ذریعے سے قطب شمالی کا ارتفاع معلوم۔ پھر وہاں ایک کھوٹی گاڑ دی اور ایک لمبی رسی اس میں باندھ کر ٹھیک شمالی کی سمت چلے۔ رسی جہاں ختم ہوگئی وہاں ایک دوسری کھوٹی گاڑ دی اور اس میں ایک ایک رسی باندھ کر پھر شمالی سمت کو چلے اور ایک جگہ ٹھہر کر رصد سے دیکھا تو قطب شمالی کا ارتفاع ایک درجہ بڑھ گیا تھا۔ اب جس قدر مسافت طے ہوئی تھی اس کی مساحت کی تو ۶۶ میل اور دو ٹلٹ میل ٹھہری۔ اس سے نتیجہ نکالا کہ آسمان کے ہر ایک درجے کے مقابل زمین کی سطح ۶۶ میل اور دو ٹلٹ ہے۔ پھر اسی مقام سے ٹھیک جنوب کی طرف چلے اور اسی طرح رسیاں باندھتے گئے۔ یہاں قطب شمالی کا ارتفاع لیا تو معلوم ہوا کہ ایک درجہ کم ہے۔ اب اس طرح حساب لگایا کہ ایک درجے کے مقابل زمین کی جو مسافت ٹھہری تھی، اس کو تین سو ساٹھ میں ضرب دیا، کیونکہ آسمان کے درجے اسی قدر قرار دیے گئے ہیں۔ اس حساب سے محیط زمین ۲۴ ہزار میل ٹھہرا۔“ (المامون، حصہ دوم، اعظم گڑھ، ۱۹۵۷ء، ص ۱۶۷، ۱۶۸۔ نیز دیکھیے وفیات الاعیان و انباء ابناء الزمان۔ انگریزی ترجمہ M.de Slane مرتبہ

ڈاکٹر معین الحق، جلد پنجم، کتاب بھون، نئی دہلی، ۱۹۹۶ء، ص ۲۰۸، ۲۰۹)

سطور بالا میں فراہم کردہ تفصیلات کے مطالعے سے عربوں میں علم ہیئت کے آغاز اور عہد مامون تک اس کے ارتقاء کا ایک واضح خاکہ ذہن میں آ جاتا ہے۔ عہد مامون کے بعد بھی علم ہیئت کے شعبے میں کمی بیشی کے ساتھ تحقیقات کا سلسلہ جاری رہا۔ آگے چل کر گیارہویں صدی عیسوی میں البیرونی نے اپنی گراں قدر اور قابل ستائش تحقیقات کے ذریعہ اس میدان میں کارہائے نمایاں انجام دیے۔ یہی نہیں بلکہ اس نے اپنے پیش روؤں کی اغلاط کی تصحیح بھی کی، متعدد اضافے بھی کیے اور مایہ ناز کتابیں تصنیف کیں، جن سے یورپی ہیئت دانوں نے بھی رہنمائی حاصل کی۔ اس حقیقت کی جانب راقم الحروف اپنے ایک مکتوب مشمولہ آجکل (مارچ ۲۰۰۹ء) میں اشارہ کر چکا ہے۔ اس موضوع پر آئندہ کبھی ایک بھرپور مضمون سپرد قلم کرنے کی کوشش کی جائے گی۔

مشرق کے علاوہ مغرب یعنی مسلم اسپین میں بھی علم ہیئت کے فروغ کی جانب خاصی توجہ مبذول کی گئی۔ یہ ایک مستقل باب ہے۔ اس موضوع پر راقم الحروف شعبہ عربی، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے زیر اہتمام منعقدہ سہ روزہ سمینار (۲۵-۲۶ مارچ ۲۰۱۰ء) میں Astronomy in Muslim Spain کے عنوان سے ایک مقالہ پیش کر چکا ہے، جس میں ابوالقاسم مسلمہ المجریطی (م درمیان ۱۰۰۴ء و ۱۰۰۷ء)، ابواسحاق ابراہیم بن یحییٰ الزرقانی (م ۱۰۸۴ء)، جابر بن فلح (م درمیان ۱۱۴۰ء و ۱۱۵۰ء) اور نور الدین البطر و جی (م ۱۲۰۴ء) کی کاوشوں کا جائزہ لیا گیا ہے۔ یہ مقالہ مذکورہ سمینار کی شائع شدہ Proceedings (مارچ ۲۰۱۱ء) میں شامل ہے۔ اس کا مطالعہ فائدے سے خالی نہ ہوگا، تاہم اس موضوع پر مزید تحقیق و جستجو اور جگر کاوی کی ضرورت ہے۔

تعلیقات و حوالہ جات

(۱) Astronomy کو عربی میں ”علم البیہ“ (Science of the Aspect (of the Universe) کہتے ہیں۔ اسے ”علم الفلاک“ (Science of celestial Spheres) بھی کہا جاتا ہے، اس کے عالم کے لیے ”فلکی“ (Astronomer) کی اصطلاح رائج ہے۔ یہ علم یوں تو ستاروں کے حرکات کے مشاہدہ و مطالعہ پر

مشتمل ہے مگر پنج وقتہ نمازوں کی صحیح وقت پر ادائیگی کے پیش نظر شب و روز کے اوقات معلوم کرنے کا علم ”یعنی علم المیقات“ یا ”علم الموافیت“ (Science of the Fixed Time) بھی اس کے تحت آجاتا ہے۔ (دیکھیے انسائیکلو پیڈیا آف اسلام، جلد اول، لائڈن، ۱۹۱۳ء، ص ۴۹۷، ۴۹۸)۔

(۲) Astrology انسانی زندگی اور دنیا میں رونما ہونے والے حالات پر ستاروں کے اثرات کے مطالعے پر مبنی ہے۔ عربی میں اس کو ”علم احکام النجوم“ (The Science of the Decrees of the Star) یا صناعت قضا یا النجوم (The Art of the Decrees of the Stars) یا مختصر علم (صناعة) الاحکام کہا جاتا ہے۔ تیرہویں صدی عیسوی سے تعلق رکھنے والے بعض مسلم دانشوروں نے ”علم النجامة“ کی اصطلاح بھی استعمال کی ہے۔ اس علم کے ماہر کو ”احکامی“ یا ”منجم“ (Astrologer) کہا جاتا ہے۔ یہاں یہ بات بھی قابل ذکر ہے کہ اٹھارہویں صدی عیسوی تک ماہر علم ہیئت (Astronomer) کو بھی منجم کہا جاتا تھا۔ چنانچہ مسعودی نے مروج الذهب میں نو بخت ابراہیم الفزاری علی بن عیسیٰ الاصطربلابی وغیرہ کے ناموں کے ساتھ لفظ منجم کا استعمال کیا ہے (دیکھیے جلد چہارم، بیروت ۱۹۸۳ء، ص ۲۲۳)۔ مگر انیسویں صدی عیسوی سے Astrologer اور Astronomer کے مابین فرق کیا جانے لگا اور اول الذکر کے لیے منجم اور آخر الذکر کے لیے فلکی کا استعمال عام ہو گیا (دیکھیے انسائیکلو پیڈیا آف اسلام، جلد اول، ص ۴۹۴)۔ آخر میں ایک بات اور وہ یہ کہ شروع میں Astrology اور Astronomy کے لیے علاحدہ علاحدہ طور پر یا دونوں کے لیے یکجا طور پر بلا تفریق علم (یا صناعت) النجوم، علم صناعت النجوم، علم النجوم کی اصطلاحات بھی رائج تھیں۔ (ایضاً)

(۳) دیکھیے ندوی، عبدالحلیم، عربی ادب کی تاریخ، جلد سوم، دہلی، ۲۰۰۰ء، ص ۷۰۸۔

(۴) دیکھیے ابن الندیم، کتاب الفہرست، الجزء العاشر، طہران، ۱۹۷۱ء، ص ۴۱۹ اور جرجی زیدان، تاریخ التمدن الاسلامی، الجزء الثالث، بیروت، تاریخ درج نہیں، ص ۱۵۰۔

(۵) یہ کتاب ۶۲۸ء میں راجہ دیا گرکھ (Dayagurumukh) کے لیے تصنیف کی گئی تھی۔ یہ ۲۵ ابواب پر مشتمل ہے۔ اس کے دو ابواب علم حساب پر ہیں اور بقیہ کا تعلق علم ہیئت سے ہے، جن میں سورج گہن (Solar Eclipse)، چاند گہن (Lunar Eclipse)، ستاروں کے اقتران اور ان کے حرکات و منازل وغیرہ زیر بحث آئے ہیں۔ کتاب مذکور ”برہم سدھانت“ اور سورہ سدھانت کے نام سے بھی جانی جاتی ہے۔ اصل کتاب سدھا کر دیوی کی کوششوں سے ۱۹۰۲ء میں شائع ہو چکی ہے۔ مگر اس کا عربی ترجمہ نایاب ہے (مزید معلومات

کے لیے دیکھیے صاعدا ندی، طبقات الامم، اردو ترجمہ ۱۳۴۶ھ، ص ۱۵؛ The New Encyclopaedia Britannica جلد دوم، شکاگو، ۱۹۹۷ء، ص ۴۶۱؛ The Encyclopaedia Americana جلد چہارم، ۱۹۸۴ء، ص ۴۱۰؛ The Columbia Encyclopaedia، نیویارک، ۱۹۵۰ء، ص ۲۴۲ اور مقبول احمد Indo-Arab Relations، نئی دہلی، ۱۹۶۹ء، ص ۱۱۔

(۶) دیکھیے History of the Arabs, P.K.Hitti، لندن ۱۹۷۲ء، ص ۳۰۷ و ۳۰۸، نیز دیکھیے طبقات الامم، اردو ترجمہ از اختر جونا گڑھی، اعظم گڑھ ۱۳۴۶ھ، ص ۱۵، ۸۵، ۸۶، ۱۰۳؛ مقالات شبلی، جلد ششم، اعظم گڑھ، مقام تاریخ کردہ خوردہ، ص ۱۰۲، ۱۰۱۔ متاخرین نے مذکورہ عربی ترجمے کا نام ”السندھند الکبیر“ لکھا ہے۔ اس کی وجہ آگے بتائی جائے گی۔

(۷) اس کے برعکس سید سلیمان ندویؒ نے ”عرب و ہند کے تعلقات“ (اعظم گڑھ ۱۹۹۲ء، ص ۱۲۵، ۱۳۷) میں قفطی کی تصنیف اخبار الحکماء (مصر، ص ۱۷۷) کے حوالے سے تحریر فرمایا ہے کہ ”سدھانت“ کو عربی میں اس ہندوستانی پنڈت نے بذات خود منتقل کیا تھا اور اس میں اس نے ابراہیم فزاری سے مدد لی تھی۔ مگر ان کی یہ تحقیق درست نہیں معلوم ہوتی۔ اس سلسلے میں پروفیسر مقبول احمد صاحب کا بیان زیادہ قرین قیاس معلوم ہوتا ہے، جس کا خلاصہ یہ ہے کہ جب ہندوستان سے علم حساب اور علم ہیئت کی کتابیں آئیں تو خلیفہ منصور کے حکم کے مطابق وہ سب پنڈتوں کی اعانت سے مسلم علماء کے ذریعے عربی میں منتقل کی گئیں (دیکھیے Indo-Arab Relations، ص ۱۰)۔ آگے چل کر تو انہوں نے یہ واضح طور پر لکھ دیا ہے کہ ”سدھانت“ کا عربی ترجمہ الفز اری (?) نے کیا تھا۔ (دیکھیے ص ۱۱)۔ اس عبارت میں صرف الفز اری تحریر ہے، جس سے یہ عیاں نہیں ہو پاتا کہ اس سے مقبول صاحب (۱۹۲۱ء-۱۹۹۸ء) کی مراد محمد بن ابراہیم الفز اری ہے یا ابراہیم بن حبیب الفز اری۔ لیکن اس سے یہ بات ضرور ثابت ہو جاتی ہے کہ ہندوستانی پنڈت کی حیثیت مترجم کی نہیں بلکہ معاون کی تھی۔ مقبول صاحب کی مذکورہ کتاب کے ص ۱۲ پر ابراہیم بن حبیب الفز اری کا ذکر ”کتاب الترتیب“ کے مولف کی حیثیت سے آیا ہے، جسے ۸۶ء کے بعد کی تالیف قرار دیا گیا ہے۔ یہ اطلاع محل نظر ہے کیونکہ ابراہیم کا انتقال اس سے بہت پہلے ۷۷ء میں ہو چکا تھا۔ صاعدا ندی، جرجی زیدان، علامہ شبلی اور حطی نے محمد بن ابراہیم الفز اری کو ہی سدھانت کا اصل عربی مترجم تسلیم کیا ہے۔ اس کا ذکر اوپر آچکا ہے۔ اتنے شواہد کی موجودگی میں محمد الفز اری کے علاوہ کسی اور کو عربی مترجم ماننا نامناسب معلوم ہوتا ہے۔ جہاں تک محمد بن ابراہیم الفز اری اور ابراہیم بن حبیب الفز اری

کے مابین رشتے کا تعلق ہے، وہ ان کے ناموں سے عیاں ہے یعنی اس کی نوعیت باپ اور بیٹے کی تھی۔ محمد کے علاوہ، ابراہیم کا ایک اور بیٹا تھا، جس کا نام اسحاق تھا۔ اسی لیے ابراہیم کی کنیت ابواسحاق تھی اور اس کا پورا نام ابو اسحاق ابراہیم بن حبیب الفزاری تھا۔ (دیکھیے کتاب الفہرست، ص ۱۸۸، ۳۳۳)۔ اس ضمن میں مولانا ابو الکلام آزاد (م ۱۹۵۸ء) کی رائے کو پیش کرنا بھی کچھ غیر مناسب نہ ہوگا، موصوف کے نزدیک سدھانت کے عربی مترجم کا نام ابراہیم بن الحبيب الفزاری تھا۔ علاوہ ازیں انہوں نے اس کو عربی کے پہلے زئج (Astronomical Tables) کا مرتب بھی قرار دیا ہے۔ مولانا نے قول اول کی تائید میں ”کتاب الہند“ (ص ۲۰۸) از البیرونی اور ”تاریخ الحکماء“ (مطبوعہ لیزک، ص ۲۷۰) از قفطی کا حوالہ دیا ہے (دیکھیے البیرونی اور جغرافیہ عالم، دہلی، ۲۰۰۴ء، ص ۶۰)۔ قفطی کی کتاب کا ایک حوالہ اوپر گزر چکا ہے جس میں ہندوستانی پنڈت کو سدھانت کا اصل عربی مترجم قرار دیا گیا ہے۔ ایک ہی کتاب میں دو مختلف بیانات کی وجہ سمجھ نہیں آتی لیکن چونکہ یہ کتاب اس وقت میرے پیش نظر نہیں ہے، اس لیے اس کے بارے میں حتمی طور پر کچھ عرض کرنا غیر ممکن ہے۔ جہاں تک ”کتاب الہند“ کا تعلق ہے، اس کا اردو ترجمہ از سید اصغر علی (جلد دوم، دہلی، ۱۹۴۲ء) میرے پاس موجود ہے۔ علاوہ ازیں اس کا مختصر انگریزی ترجمہ از ڈاکٹر سخاؤ (Sachau) بہ عنوان "India-Al-Biruni" (مطبوعہ دہلی، ۱۹۸۳ء) بھی میری تحویل میں ہے، جو پروفیسر قیام الدین احمد کا مرتبہ ہے۔ اول الذکر میں کوئی پانچ جگہ یہ نام میری نظر سے گزرا مگر ہر جگہ صرف ”الفزاری“ تحریر ہے اور کہیں بھی پورا نام مرقوم نہیں ہے۔ مثال کے طور پر دیکھیے صفحات ۱۰۹، ۱۰۹ (دو بار)، ۱۴۶، ۱۵۱۔ یہی صورت حال انگریزی ترجمے کی ہے۔ اس میں بھی کوئی چھ مقامات (دیکھیے ص ۷۹، ۱۳۸، ۱۹۴، دو بار ۱۹۵، ۱۹۷) پر صرف الفزاری لکھا ہوا ہے۔ اس سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ اصل عربی نسخے میں بھی یہ نام مکمل طور پر نہیں لکھا گیا ہے۔ مولانا آزاد نے خدا جانے کس بنیاد پر ”الفزاری“ کو ابراہیم بن الحبيب الفزاری تصور فرمالیا ہے، یہ محمد بن ابراہیم الفزاری بھی تو ہو سکتا ہے۔ چنانچہ مذکورہ انگریزی ترجمے کے آخر میں شامل شدہ اپنے ایک حاشیے میں پروفیسر قیام الدین احمد نے محمد بن ابراہیم الفزاری ہی لکھا ہے (دیکھیے ص ۲۸۲، حاشیہ نمبر ۳۳)۔ اس سے یہ بالکل واضح ہے کہ پروفیسر موصوف کے نزدیک الفزاری سے ابراہیم بن حبیب الفزاری نہیں بلکہ محمد بن ابراہیم الفزاری مراد ہے۔ ان کے خیال کی تائید دیگر معتبر مآخذ سے بھی ہوتی ہے، جن کا ذکر اوپر آچکا ہے۔ ہاں یہ ہو سکتا ہے کہ اولین ترجمے کے بعد ابراہیم الفزاری نے بھی سدھانت کا ترجمہ عربی میں کیا ہو۔ اس کا ذکر آگے آ رہا ہے۔

- (۸) دیکھیے کتاب الفہرست، ص ۳۳۲ اور History of the Arabs، ص ۳۷۵۔
- (۹) دیکھیے عرب و ہند کے تعلقات، ص ۱۳۷۔ (۱۰) دیکھیے کتاب الفہرست، ص ۳۳۲۔
- (۱۱) دیکھیے عرب و ہند کے تعلقات، ص ۱۳۷۔ Carra de Vaux نے اس کا نام یعقوب الفزاری لکھا ہے جو قطعاً غلط ہے، دیکھیے Astronomy and Mathematics مشمولہ The Legacy of Islam مرتبہ Alfred Guillaume و Thomas Arnold، لندن، ۱۹۴۳ء، ص ۳۸۰۔
- (۱۲) ایضاً، ص ۱۳۹۔ (۱۳) تفصیل کے لیے دیکھیے کتاب البندارد و ترجمہ از سید اصغر علی، ج ۲، دہلی، ۱۹۴۲ء، ص ۶۰، ۱۴۶، ۱۵۱، ۱۶۲، ۱۶۳، ۱۷۲، ۱۷۳، ۱۷۴، ۲۱۵، ۲۱۶، ۲۱۷، ۲۱۸۔ (۱۴) دیکھیے کتاب الفہرست، ص ۳۳۶۔
- (۱۵) دیکھیے طبقات الامم، اردو ترجمہ، ص ۱۰۳۔ (۱۶) دیکھیے کتاب الفہرست، ص ۳۳۳۔
- (۱۷) دیکھیے History of the Arabs، ص ۳۷۵۔
- (۱۸) Aryabhatta کی پیدائش پٹنہ کے قریب واقع ایک مشہور مقام 'کسم پورہ' میں ہوئی تھی۔ اس کی تصنیف و تالیف کا سلسلہ کم عمری ہی میں شروع ہو گیا تھا۔ اس نے اپنی گراں قدر منظوم کتاب ”آریہ بھٹیہ“ ۴۹۹ء میں تصنیف کی۔ اس وقت اس کی عمر صرف ۲۳ سال تھی۔ اٹھارہ ابواب پر مشتمل یہ کتاب علم ہیئت اور حساب سے متعلق ہے۔ اس میں منجملہ دیگر اشیاء کے سورج گہن اور چاند گہن کے مسائل بھی زیر بحث آئے ہیں۔ آریہ بھٹ پہلا ہندوستانی فلکی (Astronomer) تھا جس نے یہ بتایا کہ زمین مدور ہے اور یہ اپنے محور پر گردش کرتی ہے۔ علاوہ ازیں اسے وقت شماری کے دو مخصوص نظاموں کے رائج کرنے کا فخر بھی حاصل ہے۔ اپنی خداداد لیاقت و صلاحیت کی بنا پر اس نے حساب اور علم ہیئت میں کافی شہرت حاصل کی۔ بعض محققین کے مطابق وہ مشہور نالندہ یونیورسٹی کا Kulapa (وائس چانسلر) بھی ہوا، جسے اس زمانے میں بہت بڑا اعزاز تصور کیا جاتا تھا (مزید معلومات کے لیے دیکھیے Britannica Ready Reference Encyclopaedia، جلد اول، نئی دہلی، ۲۰۰۴ء، ص ۱۲۵؛ The New Encyclopaedia Britannica، جلد اول، شکاگو، ۱۹۹۷ء، ص ۶۱۱ اور The Encyclopaedia Americana، جلد دوم، U.S.A.، ۱۹۸۴ء، ص ۴۲۵)۔
- (۱۹) دیکھیے عرب و ہند کے تعلقات، ص ۱۳۷، ۱۳۹؛ مقبول احمد، Indo-Arab Relations، ص ۱۱، اور India-Al-Biruni، ص ۱۹۵۔
- (۲۰) دیکھیے عرب و ہند کے تعلقات، ص ۱۳۷، Indo-Arab Relations، ص ۱۱، The Columbia

Encyclopaedia، نیویارک، ۱۹۵۰ء، ص ۲۴۲؛ The Encyclopaedia Americana، جلد چہارم،
 U.S.A. ۱۹۸۴ء، ص ۱۴۱۰ اور طبقات الامم اردو ترجمہ، ص ۱۷، حاشیہ ۱۴ از قاضی احمد میاں اختر جو ناگڑھی۔
 (۲۱) دیکھیے مروج الذہب، ج ۴، بیروت، ۱۹۸۳ء، ص ۲۲۳ اور تاریخ التمدن الاسلامی، ج ۳، ص ۱۵۲۔
 (۲۲) دیکھیے کتاب الفہرست، ص ۳۲۷ نیز دیکھیے مقالات شبلی، ج ۶، ص ۱۲۱ اور تاریخ التمدن الاسلامی، ج ۳،
 ص ۱۵۴۔ (۲۳) دیکھیے کتاب الفہرست، ص ۳۰۵؛ تاریخ التمدن الاسلامی، ج ۳، ص ۱۶۲؛ طبقات الامم
 اردو ترجمہ، ص ۲۳، حاشیہ نمبر ۱، انسائیکلو پیڈیا آف اسلام، ج ۱، ص ۴۹۸۔ (۲۴) ”انواء“، علم ہیئت و نجوم کا
 اصطلاحی لفظ ہے۔ اس سے وہ ستارے مراد ہیں جن میں سے ایک کے طلوع ہونے کے وقت دوسرا غروب ہوتا
 ہے اور وہ ستارے بھی جن کا طلوع ہونا بارش ہونے کی علامت سمجھا جاتا ہے۔ جن کتابوں میں ان ستاروں کی
 تفصیل بیان کی جاتی ہے ان کو ”کتب الانواء“ کہتے ہیں (دیکھیے کتاب البہد، اردو ترجمہ، ج ۲، دہلی، ۱۹۴۲ء،
 ص ۲۳۹، حاشیہ از مولوی سید عطا حسین)۔ (۲۵) دیکھیے کتاب الفہرست، ص ۳۳۳۔ (۲۶) ایضاً۔

حکمائے اسلام

(حصہ اول و دوم)

مولانا عبد السلام ندوی

حصہ اول: اس میں یونانی فلسفہ کے تاریخی مآخذ اور مسلمانوں میں علوم عقلیہ کی
 اشاعت کی مختصر تاریخ اور پانچویں صدی تک کے اکابر حکمائے اسلام کے مستند حالات،
 ان کی علمی خدمات اور ان کے فلسفیانہ نظریات کی تفصیل کی گئی ہے۔

قیمت: ۱۵۰ روپے

حصہ دوم: اس میں متوسطین و متاخرین حکمائے اسلام کے مستند حالات، ان کی علمی
 خدمات اور ان کے فلسفیانہ نظریات کی تفصیل کی گئی ہے۔ قیمت: ۴۰ روپے

فکر اسلامی کی نشاۃ ثانیہ اور علامہ اقبال

ڈاکٹر سید عبدالباری

بیسویں صدی میں مغرب کے فلسفوں نے مشرق کے نظام فکر کی، یہ محسوس ہو رہا تھا کہ چولیس ہلا کر رکھ دی تھیں۔ علامہ اقبال اور دیگر مفکرین اسلام اس صورت حال پر مضطرب تھے۔ اسی زمانہ میں مولانا ابوالکلام آزاد نے الہلال کے صفحات پر اسلامی علوم اور قرآنی فکر و فلسفہ کی عصر رواں میں اہمیت اور معنویت کو پورے خروش کے ساتھ پیش کیا۔ ڈارون کے نظریہ ارتقا سے مارکس کے جدلیاتی فلسفہ اور اشتراکی تصور حیات و کائنات تک کا ہر طرف بول بولا تھا اور نئی نسل کا ایک بڑا طبقہ مشرق و مغرب میں مذہب کو انسانی زندگی کے مسائل و امور سے خارج از بحث قرار دے رہا تھا۔ علامہ اقبال نے اپنی فارسی و اردو زبان میں شاعری کے ذریعہ مغربی تہذیب اور اس کے فلسفہ حیات کی لامعنیت اور عصر حاضر میں قرآن کی افضلیت کا نغمہ چھیڑا۔ علامہ نے خطبات مدراس کے ذریعہ اسلامی فکر و فلسفہ کی تدوین نو کے ولولے کو صفحہ قرطاس پر نمایاں کیا۔ پھر بیسویں صدی کی دوسری اور تیسری دہائی میں ان کے سینے میں جو چنگاریاں روشن ہوئی تھیں ان کو بڑے اضطراب کے ساتھ نمایاں کیا۔ علامہ جن موضوعات پر قلم اٹھانے کے لیے بے چین تھے ان کی تفصیلات ہمیں چونکا دیتی ہیں۔ علامہ اپنے دوست سر اس مسعود کو ۲۰ مئی ۱۹۳۵ء میں لکھتے ہیں:

”چراغِ سحر ہوں، بجھا چاہتا ہوں، تمنا ہے مرنے سے پہلے قرآن کریم سے متعلق اپنے افکار قلم بند کر جاؤں اور جو تھوڑی سی ہمت و طاقت ابھی مجھ میں باقی ہے اسے اس خدمتِ دین کے لیے وقف کر دینا چاہتا ہوں“۔ پروفیسر

۳۲/۱ شاہین باغ، نئی دہلی۔

رفیع الدین ہاشمی اپنے مقالہ ”اقبال کے ذوق علم و تحقیق“ میں رقم طراز ہیں:

”نہیں کہا جاسکتا کہ موعودہ کتاب میں اقبال کیا طریق تفسیر اختیار کرتے لیکن اس سلسلہ کی بعض تحریروں اور گفتگوؤں سے پتہ چلتا ہے کہ مقدمہ القرآن لکھنے سے ان کی بنیادی غایت خدمت دین تھی اور اپنی موعودہ کتاب میں وہ امت مسلمہ کو قرآنی رموز و نکات سے آگاہ کرنا چاہتے تھے تاکہ مسلمانان عالم اس کی روشنی میں اپنے سیاسی و معاشی مسائل حل کر سکیں۔ وہ یہ بھی ارادہ رکھتے تھے کہ اسلام اور قرآن پر یورپ کے متعصبانہ اور بے بنیاد اعتراضات کا مدلل جواب دیا جائے۔ اگر اقبال مقدمہ القرآن لکھنے میں کامیاب ہو جاتے تو بلاشبہ عصر حاضر میں یہ ان کا بڑا کارنامہ ہوتا۔“ (اقبال ریویو حیدرآباد، ص ۳۶، نومبر ۲۰۰۹ء)

اقبال کا دوسرا منصوبہ اسلامی فقہ کی تدوین جدید کا تھا۔ بقول رفیع الدین ہاشمی یہ علامہ کی سب سے بڑی خدمت ہوتی۔ صوفی تبسم کے نام ۲ ستمبر ۱۹۲۵ء کے خط میں لکھتے ہیں ”میرا عقیدہ ہے کہ جو شخص اس وقت قرآنی نگاہ سے زمانہ حال کے اصول قانون پر ایک تنقیدی نگاہ ڈال کر احکام قرآنیہ کی ابدیت ثابت کرے گا وہی اسلام کا مجدد ہوگا اور بنی نوع انسان کا سب سے بڑا خادم وہی شخص ہوگا۔“ (اقبال ریویو حیدرآباد، رفیع الدین ہاشمی، ص ۳۶)

علامہ اقبال فقہ اسلامی کی مفصل تاریخ پر سخت زور دیتے تھے اور اس پر خود کام شروع کیا تھا۔ انہوں نے ایک کتاب Islam as I understand it لکھنے کا منصوبہ بنایا تھا فقہ کی تدوین کے لیے انہوں نے مولانا شبلی، سید سلیمان ندوی اور سید انور شاہ کشمیری کو لاہور بلانا چاہا تھا۔ (اقبال نامہ، ص ۱۲۵، شیخ عطاء اللہ، اقبال اکیڈمی لاہور) ۱۹۱۵ء میں اسرار خودی کی اشاعت پر ان کے خلاف طوفان اٹھ کھڑا ہوا۔ انہوں نے تصوف پر ایک کتاب لکھنی شروع کی مگر ایک دو باب ہی لکھ سکے۔ اقبال کی علمی منصوبوں میں بہت سے موضوعات شامل تھے مثلاً فصوص الحکم پر ایک تنقیدی جائزہ، قلب و دماغ کی سرگذشت وغیرہ۔ بقول رفیع الدین ہاشمی اقبال کے ان منصوبوں کا محرک ملی انحطاط کا وہ شدید احساس تھا جس نے اقبال کو ساری عمر مضطرب رکھا اور وہ تصنیفی منصوبوں کے ذریعہ چاہتے تھے کہ اپنے ملک کے تعلیم یافتہ لوگوں پر دین کے اثرات

منکشف کرجائیں تاکہ وہ دین کے قریب آجائیں۔ (اقبال نامہ بحوالہ علامہ اقبال شخصیت اور فن، رفیع الدین ہاشمی، ص ۲۴۲، لاہور)

اقبال کو یہ احساس تھا کہ بڑے علمی منصوبوں کی تکمیل کے لیے اجتماعی کاوشوں، علمی اداروں اور اکیڈمیوں کی ضرورت ہوتی ہے، جیسا کہ یورپ میں ہو رہا ہے، اقبال کے ایک نیازمند خواجہ عبدالوحید نے ۱۹۲۸ء میں اسلامک ریسرچ انسٹی ٹیوٹ قائم کیا تاکہ مسلمان نوجوانوں کو اسلامی تمدن و تاریخ کے مطالعہ کی طرف راغب کیا جائے۔ علامہ اقبال کو اس ادارہ سے بڑی امیدیں وابستہ تھیں۔ وہ اس سے کافی دلچسپی لکھتے تھے اور اس کے کاموں میں علمی تعاون کرتے تھے۔ (مجالس اقبال، جعفر بلوچ، دارالتذکیر لاہور، ۲۰۰۳ء)

پھر علامہ کی راہنمائی میں ۱۹۳۱ء میں علوم اسلامیہ کی ترویج و تحقیق کے لیے لاہور میں ادارہ معارف اسلامیہ قائم کیا گیا۔ اس کے تمام کام ان کی راہنمائی میں انجام پاتے تھے۔ اقبال کو بقول جعفر بلوچ اس ادارہ سے کافی امیدیں وابستہ تھیں۔ اس کے لیے علامہ نے ریاست حیدرآباد سے سالانہ امداد بھی منظور کرائی تھی۔ بقول عبدالمجید سالک ”مدت دراز سے علامہ کے دماغ میں یہ تجویز گردش کر رہی تھی کہ ایک علمی مرکز قائم کیا جائے جہاں دینی و دنیوی علوم کے ماہر جمع کیے جائیں اور ان ماہروں کو خورد و نوش کی فکر سے آزاد کر دیا جائے تاکہ ایک گوشہ میں بیٹھ کر علامہ کے نصب العین کے مطابق اسلام، تاریخ اسلام اور شرع اسلام کے متعلق ایسی کتابیں لکھی جائیں جو آج کل کی دنیائے فکر میں انقلاب پیدا کر دیں“۔ (عبدالمجید سالک، بزم اقبال لاہور ۱۹۵۵ء)

صاحب زادہ آفتاب احمد کے نام ایک خط میں وہ اسلامی تاریخ، آرٹ، قانون اور تہذیب و تمدن کے مختلف پہلوؤں پر حاوی عالموں کی تیاری، ان کی تعلیم و تربیت اور اسلامی ادبیات و افکار میں تحقیق کی ضرورت کا ذکر کرتے ہیں۔ (اقبال نامہ، مرتبہ شیخ عطاء اللہ، لاہور) اس سلسلہ میں اپنے آخری دور میں علامہ کی ترجیحات پر روشنی ڈالتے ہوئے پروفیسر رفیع الدین ہاشمی لکھتے ہیں:

”یہاں ایک دلچسپ نکتے کی نشان دہی ضروری ہے اور وہ یہ کہ آخری زمانے میں

اسلامی فقہ میں تحقیق کا مسئلہ اقبال کی نظر میں جس قدر اہمیت اختیار کر گیا تھا، فلسفہ و تصوف جیسے موضوعات اسی قدر ان کی نظر سے گر گئے تھے۔ علمی زندگی خصوصاً مسلم نشاۃ ثانیہ کے ضمن میں فلسفے اور تصوف کی افادیت ان کی نظر میں مشکوک ہو گئی تھی۔ پروفیسر عمر الدین کے نام ۸ مئی ۱۹۳۶ء کو لکھتے ہیں: مسلم فلسفے اور تصوف جیسے موضوعات میں میری زیادہ تر دلچسپی ختم ہو گئی ہے۔ اسلامی فقہ کے وہ اصول و ضوابط جن کا تعلق معاملات سے ہے اور جو دنیا کی اقتصادی اور تہذیبی تاریخ کے نقطہ نظر سے کہیں زیادہ اہم ہیں ان کے مقابلہ میں فلسفہ اور تصوف فقط قیاس آرائی (Mere Speculation) کی حیثیت رکھتے ہیں اور غیر شعوری طور پر یہ اسلام میں انتشار اور افتراق کا سبب بھی بنتے ہیں۔ (نقوش اقبال نمبر دوم، دسمبر ۱۹۷۷ء، ص ۱۸)

چنانچہ وہ ضرب کلیم کی نظموں میں فلسفہ و خانقاہی تصوف پر اظہار خیال کرتے ہیں۔
 ہے فلسفہ زندگی سے دوری انجام خرد ہے بے حضوری
 مست رکھو ذکر و فکر صبح گاہی میں اسے پختہ تر کرد و مزاج خانقاہی میں اسے

۹ جنوری ۱۹۲۸ء کو پورے ملک میں یوم اقبال منایا گیا۔ اس موقع پر سرسکندر حیات نے یہ تجویز پیش کی کہ ہر جگہ اقبال کو کیسہ زر پیش کیا جائے۔ علامہ نے یہ تجویز مسترد کر دی اور کہا کہ بہتر ہوگا اسلامیہ کالج لاہور میں اسلامی علوم کی تحقیق کے لیے ایک چیئر یا خصوصی شعبہ قائم کیا جائے اور سرمایہ اس کے لیے فراہم کیا جائے۔ ڈاکٹر جاوید اقبال لکھتے ہیں کہ اقبال کی یہ اہم تمنا تھی کہ مسلم یونیورسٹی کے اندر یا کسی پرسکون مقام پر ایک چھوٹی سی بستی کی صورت میں ایسا ادارہ قائم کیا جائے جس میں بہترین دل و دماغ کے مسلم نوجوان خالص اسلامی ماحول میں اسلامی ریاضیات، طبیعیات، کیمیا، تاریخ فقہ اور دینیات کی تعلیم حاصل کر کے علوم جدیدہ کا علوم قدیمہ سے تعلق دریافت کر سکیں۔ (سرگزشت اقبال، ڈاکٹر عبدالسلام خورشید بحوالہ رفیع الدین ہاشمی، اقبال ریویو، ۲۰۰۹ء)

اسی زمانہ میں چودھری نیاز علی جیسے درد مند کا اپنی جائیداد واقع جمال پور پٹھان کوٹ ضلع گرداس پور کا ایک حصہ خدمت دین کے لیے وقف کر کے وہاں درس گاہ قائم کرنے کے عزم کا اظہار نیک فال ثابت ہوا۔ چودھری صاحب نے کئی علماء سے راہنمائی چاہی۔ مولانا مودودیؒ

سے ان کی مفصل خط و کتابت ہوئی اور انہوں نے ایک تفصیلی نقشہ بنا کر انہیں ارسال کیا جس میں انہوں نے علمی کام کے چار شعبے (فقہ، معاشیات، علوم عمران، فلسفہ اور نظری سائنس) کی نشان دہی کی اور یہ لکھا ”سب علمی و تحقیقی کام اس بنیادی نظریہ سے کیا جائے کہ قرآن و سنت ہی علم کا اصل منبع ہے۔ سب کچھ ہم کو اسی سے لینا ہے“۔ (اقبال دارالسلام اور مودودی، اسعد گیلانی) چودھری نیاز نے علامہ کی خدمت میں حاضر ہو کر اپنے ارادہ سے آگاہ کیا اور دارالسلام کے منصوبہ پر روشنی ڈالی۔ علامہ بے حد خوش ہوئے اور انہیں بقول رفیع الدین ہاشمی اس منصوبہ میں اپنے خواب کی تعبیر نظر آئی۔ علامہ نے پٹھان کوٹ کے علمی مرکز کے لیے جامعہ ازہر کے علامہ مصطفیٰ المراغی کو خط لکھا، یہ نہایت اہم مکتوب ہے:

”ہم نے ارادہ کیا ہے کہ ہم پنجاب کی ایک بستی میں ایسے ادارہ کی بنیاد رکھیں کہ اب تک کسی اور نے ایسا ادارہ قائم نہیں کیا اور انشاء اللہ اسے اسلامی دینی اداروں میں بہت اونچی حیثیت حاصل ہوگی۔ ہم یہ چاہتے ہیں کہ کچھ ایسے لوگوں کو جو جدید علوم سے بہرہ ور ہوں، کچھ ایسے لوگوں کے ساتھ یکجا کر دیں جنہیں علوم دینی میں مہارت حاصل ہو اور جو اپنا وقت دین اسلام کی خدمت میں لگانے کو تیار ہوں۔ ہم ان لوگوں کے لیے نئی تہذیب اور جدید تمدن کے شور و شغب سے دور ایک دارالاقامہ بنادیں جو ان لوگوں کے لیے ایک اسلامی مرکز کا کام دے۔ اس میں ہم ان کے لیے ایک لائبریری ترتیب دیں جس میں وہ تمام قدیم و جدید کتابیں موجود ہوں جن کی ضرورت پیش آسکتی ہو۔ مزید برآں ان کے لیے ایک کامل و صالح گائیڈ کا تقرر کیا جائے جسے قرآن حکیم میں بصیرت تامہ حاصل ہو اور جو دنیائے جدید کے احوال و حوادث سے بھی باخبر ہوتا کہ ان لوگوں کو کتاب اللہ اور سنت رسول اللہ کی روح سمجھا سکے اور فلسفہ و حکمت، اقتصادیات و سیاسیات کے شعبوں میں فکر اسلامی کی تجدید کے سلسلہ میں انہیں مدد دے سکے تاکہ یہ لوگ اپنے علم اور قلم سے اسلامی تمدن کے احیاء کے لیے کوشاں ہو سکیں۔ آپ جیسے فاضل شخص کے سامنے اس تجویز کی اہمیت کو واضح

کرنے کی چنداں ضرورت نہیں، چنانچہ میں آپ سے درخواست کرتا ہوں کہ آپ ازراہ کرم ایک روشن دماغ مصری عالم کو جامعہ ازہر کے خرچ پر بھجوانے کا بندوبست فرمائیں۔ یہ شخص علوم شرعیہ نیز تاریخ و تمدن اسلامی میں کامل دست گاہ رکھتا ہوا اور یہ بھی لازم ہے کہ اسے انگریزی زبان پر قدرت حاصل ہو۔ (۳۹ خطوط مودودی، مرتبہ رفیع الدین ہاشمی، خطوط اقبال، رفیع الدین ہاشمی کی زبان ادبی لاہور، ۱۹۷۶ء)

شیخ الازہر نے جواب دیا کہ ہمارے علمائے ازہر میں کوئی ایسا نہیں جو انگریزی زبان پر قدرت رکھتا ہو۔ سید نذیر نیازی اور میاں محمد شفیع کے بقول علامہ کی نظر سے مولانا مودودی کی تحریریں گزری تھیں اور ان کے علم اور فہم اسلام سے علامہ مطمئن تھے۔ انہوں نے چودھری نیاز کو مشورہ دیا کہ وہ مولانا مودودی کو پٹھان کوٹ بلائیں۔ مولانا مودودی نے اس دعوت کو قبول کیا اور لاہور آکر چودھری نیاز علی خاں اور علامہ محمد اسد کے ساتھ علامہ اقبال سے ملاقات کی اور مجوزہ ادارہ کے منصوبوں، منہاج اور طریقہ کار پر علامہ سے مفصل بات چیت کی اور مارچ ۱۹۳۸ء میں حیدرآباد دکن سے جمال پورہ پٹھان کوٹ منتقل ہو گئے، خود علامہ اقبال کا ارادہ تھا کہ ہر سال چند ماہ وہاں آکر قیام کریں۔ مولانا مودودی مشورہ و راہنمائی کے لیے لاہور جانے کا پروگرام بنا ہی رہے تھے کہ سید نذیر نیازی کا خط ملا کہ جس قدر جلد ممکن ہوا لاہور آئیے، علامہ کی طبیعت بہت خراب ہے۔ اس خط کے تیسرے روز علامہ کی وفات ہو گئی۔ (بحوالہ اقبال ریویو، نومبر ۲۰۰۹ء)

اسلامی فکر کی تشکیل جدید میں سرسید کی عقلیت کی تحریک بیسویں صدی کے آغاز میں غیر موثر ہوتی جا رہی تھی۔ اگرچہ تقلید محض کے دائرہ سے نکل کر اسلام کی فکر کی توانائیوں کو قرآن حکیم سے اخذ کرنے اور مغرب کے فکری غلبہ سے دنیائے اسلام کے نوجوان ذہنوں کو نجات دلانے کے لیے ابھی کچھ اور قدم آگے بڑھانے کی ضرورت تھی۔ مولانا ابوالکلام آزاد نے الہلال کے ذریعہ نوجوان ذہنوں میں خود اعتمادی اور حرکت و عمل کی چنگاریاں پیدا کر دی تھیں مگر مولانا آزاد مغرب کی فکر و فلسفہ کی گہرائیوں میں اتر کر اس کا جواب دینے کی پوزیشن میں نہ تھے۔ عالم اسلام میں علامہ رشید رضا، جمال الدین افغانی، مفتی محمد عبیدہ وغیرہ نے جدید ذہن کو بیدار کیا اور اسلامی

سرچشموں سے فیضیاب ہونے کی راہیں ہموار کیں۔ ان لوگوں نے قرآن کو رہنما بنایا اور وحی الہی پر اپنے افکار و خیالات کی بنیاد رکھی لیکن بیسویں صدی کے ربع اول میں اقبال جیسا مفکر دنیائے اسلام کو مشیت نے عطا کیا جو اس عہد کے متکلمین اور فقہاء میں امتیازی مقام کا حامل ہے۔ پروفیسر سمیع اللہ قریشی کے الفاظ میں ہر تہذیب کی فکری بنیاد فلسفہ پر استوار ہوتی ہے جس کے سہارے وہ سیاسی، ثقافتی، عمرانی، تعلیمی اور معاشی تقاضوں سے عہدہ برآ ہوتی ہے۔ تہذیبی زوال آمادگی کا مرض اس وقت لاحق ہوتا ہے جب ان کا انداز فکر و نظر اور علم و عمل عصری تقاضوں کی پروا نہیں کرتا۔ کسی تہذیب پر نیتنے والا یہ لمحہ بے حد نازک ہوتا ہے۔ (موضوعات فکر اقبال، اقبال اکیڈمی، پاکستان، ص ۹)

اقبال جس عہد میں پیدا ہوئے، برصغیر کے مسلمان عوام ذہنی طور پر پس ماندہ اور فکری سطح پر احساس محرومی کا شکار تھے، مایوسی کی کیفیت ان پر طاری تھی، پہلی جنگ عظیم میں ترکی کی شکست اور خلافت کے زوال سے وہ اور پڑمردہ تھے۔ خود اعتمادی سے محروم تھے اور ماضی پرستی کا شکار تھے۔ علامہ اقبال کو احساس تھا کہ ”اسلام اس وقت گویا زمانے کی کسوٹی پر کسا جا رہا ہے اور شاید اسلام کی تاریخ میں ایسا وقت پہلے کبھی نہ آیا تھا“۔ (بحوالہ روزگار فقیر، فقیر وحید الدین) چنانچہ انہوں نے مسلمانوں کو ذہنی و فکری پس ماندگی سے نجات دلانے کی خاطر ”اسلام کی فکری و ثقافتی ہیئت کی تشکیل جدید“ کو موضوع بنایا۔ ۱۹۲۶ء میں سید سلیمان ندوی کو ایک خط لکھا:

”مسلمانوں پر اس وقت روحانی اعتبار سے وہی زمانہ آرہا ہے جس کی ابتداء

یورپ کی تاریخ میں لوتھر کے عہد سے ہوئی۔ مگر چونکہ اسلامی تحریک کی کوئی خاص شخصیت

رہنما نہیں ہے اس واسطے اس تحریک کا مستقبل خطرات سے خالی نہیں“۔ (اقبال نامہ)

اقبال کو مسلسل یہ فکر دامن گیر تھی کہ آخر کس طرح عصر جدید کے تقاضوں اور چیلنجز کا مسلمان سامنا کریں، صوفی غلام مصطفی تبسم کو لکھتے ہیں:

”افسوس ہے زمانہ حال کے اسلامی فقہاء یا تو زمانے کے میلان طبیعت سے

بالکل بے خبر ہیں یا قدامت پرستی میں مبتلا ہیں۔ مذہب اسلام اس وقت زمانہ کی

کسوٹی پر کسا جا رہا ہے۔“

چنانچہ فکر اسلامی کی تشکیل جدید کے موضوع پر اقبال مسلسل سوچتے رہے اور اس کے لیے منصوبے بناتے رہے۔ وہ اس تشکیل جدید کے عمل میں اسلامی مشرقی روایات کا کوئی حصہ ترک کرنے پر تیار نہ تھے اور مغربی افکار کو بھی تمام تر رد کر دینے کے قائل نہ تھے جیسا کہ اپنے خطبات میں انہوں نے مشرق کے فکری اثاثہ کو انہوں نے بڑے فخر سے پیش کیا اور مغرب کے سائنسی رویہ اور محسوسات سے گہرا رابطہ قائم رکھنے کے طرز عمل کی تحسین کی۔ اقبال کے نزدیک یہ رویہ خود مسلمانوں کی میراث ہے۔ اقبال کی خوبی یہ تھی کہ وہ مغرب سے قطعاً مرعوب نہیں تھے اور اس کے سائنسی طرز فکر کی قدر کرنے کے باوجود اسلامی اقدار کی رفعت اور مشرق کی اس پہلو سے مغرب پر برتری کا کھل کر اظہار کرتے رہے۔

اقبال اسلام کو عصر رواں میں بھی ایک زندہ قوت تسلیم کرتے تھے۔ وہ اگرچہ بے روح قدامت پرستی کے سخت خلاف تھے لیکن ان کی تنقید سرسید کی طرح ذہنی مرعوبیت کا نتیجہ نہ تھی۔ انہوں نے ۱۹۳۱ء کی مسلم کانفرنس میں ارشاد فرمایا:

”مگر آپ کے مذہب کا یہ اعلیٰ تخیل مولویوں اور فقہ پرستوں کی دقیانوسی خیال آرائیوں سے رہائی کا طالب ہے۔ یہ بات بوڑھی نسل کے لیے باعث شرم ہے کہ ہم نوجوان نسل کو اقتصادی، سیاسی نیم مذہبی خطرناک مواقع کے لیے جو موجودہ دور اپنے ہمراہ لا رہا ہے مسلح کرنے سے قاصر رہے ہیں۔“

(بحوالہ موضوعات فکر اقبال، اقبال اکیڈمی لاہور، ص ۱۱)

اقبال اسلام کو ایک سراپا حرکت دین سمجھتے تھے۔ یہ حیات و کائنات کی ماہیت کے عرفان پر زور دیتا ہے اور ان کے مطابق زندگی کے میلان و رجحان کا نام ہے۔ اسے جمود و تعطل سے سخت نفرت ہے۔ اقبال کو یقین تھا کہ اسلامی فکر اب انقلاب و ارتقاء کی راہ پر گامزن ہے اور اسے کوئی قوت دبا نہیں سکتی۔ انہوں نے واضح الفاظ میں یہ خیال ظاہر کیا ”اسلام جدید تفکر اور تجربے کی روشنی میں قدم رکھ چکا ہے اور کوئی ولی یا پیغمبر بھی اس کو قرون وسطیٰ کے تصوف کی تاریکی کی طرف واپس نہیں لے جاسکتا۔“ (حرف اقبال، بحوالہ موضوعات فکر اقبال، ص ۱۲)

اقبال قسطنطنیہ کے شعبہ دینیات کے سربراہ کو مشورہ دیتے ہیں:

”ادارہ دینیات پر کسی ایسے شخص کو پروفیسر متعین کیا جائے جس نے اسلامی دینیات اور جدید یورپین فکر و تصورات کا مطالعہ کیا ہو تا کہ وہ مسلم دینیات کو افکار جدید کا ہم پایہ بنا سکے۔ قدیم اسلامی دینیات کا تار و پود بکھر چکا ہے جس کا مدار زیادہ تر یونانی حکمت پر تھا۔ وقت آچکا ہے کہ اس کی نئی شیرازہ بندی کی جائے۔“ اقبال نامہ، شیخ عطاء اللہ، اقبال اکیڈمی لاہور، ۲۰۰۵ء)

اقبال اسلامی فکر کی نشاۃ ثانیہ کے لیے کس قدر مضطرب تھے اور ان کے سامنے کیا ترجیحات تھیں اس کا بخوبی اظہار ان کے خطبات مدراس سے ہوتا ہے جو اسلامی الہیات کی تشکیل نو کے عنوان سے شائع ہوئے۔ ان خطبات کے مقدمہ میں اقبال نے اپنی فکر کا نچوڑ پیش کیا ہے، لکھتے ہیں:

”میں نے اسلام کی روایات فکر علی ہذا ان ترقیات کا لحاظ رکھتے ہوئے جو علم انسان کے مختلف شعبوں میں حال ہی میں رونما ہوئیں الہیات اسلامیہ کی تشکیل جدید سے ایک حد تک پورا کرنے کی کوشش کی ہے۔ یہ مطالبہ غلط نہیں کہ مذہب کی بدولت ہمیں جس قسم کا علم حاصل ہوتا ہے اسے سائنس کی زبان میں سمجھا جائے، یہ وقت اس طرح کے کسی کام کے لیے بے حد مساعد ہے۔ وہ دن دور نہیں کہ مذہب اور سائنس میں ایسی ایسی ہم آہنگیوں کا انکشاف ہو جو سر دست ہماری نگاہوں سے پوشیدہ ہیں۔ تاہم یہ یاد رکھنا چاہیے کہ فلسفیانہ غور و فکر میں قطعیت کوئی چیز نہیں۔ جیسے جیسے جہان علم میں ہمارا قدم آگے بڑھتا ہے فکر کے لیے نئے نئے راستے کھل جاتے ہیں اور شاید ان نظریوں سے جو ان خطبات میں پیش کیے گئے ہیں زیادہ بہتر نظریے ہمارے سامنے آتے جائیں گے۔ ہمارا فرض بہر حال یہ ہے کہ فکر انسانی کی نشو و نما پر بہ احتیاط نظر رکھیں اور اس باب میں آزادی کے ساتھ نقد و تنقید سے کام لیتے رہیں۔“

میر غلام بھیک نیرنگ کو خطبات کے اردو ترجمے کے سلسلہ میں جو مشکلات درپیش تھیں اس کے تناظر میں لکھتے ہیں:

”ان خطبات کے مخاطب زیادہ تر وہ مسلمان ہیں جو مغربی فلسفہ سے متاثر ہیں اور اس بات کے خواہش مند ہیں کہ فلسفہ اسلام کو فلسفہ جدید کے الفاظ میں بیان کیا

جائے اور اگر پرانے تخیلات ہی میں خامیاں ہیں تو ان کو رفع کیا جائے۔ میرا کام زیادہ تر تعمیر ہی ہے اور اس تعمیر میں فلسفہ اسلام کی بہترین روایات کو ملحوظ خاطر رکھا ہے۔ (بحوالہ موضوعات فکر اقبال، پروفیسر سمیع اللہ قریشی، اقبال اکیڈمی لاہور، ص ۱۴)

اقبال نے اپنے خطبات میں بڑے حیات افروز تصورات پیش کیے ہیں۔ ان کے نزدیک حیات ایک ایسا جوہر ہے جو انسان کی خارجی و داخلی سمتوں کو متصل کرتا ہے۔ عالم موجودات میں ہر چیز متحرک ہے اور زندگی میں یقین محکم کے بغیر کسی مثبت عمل کی توقع عبث ہے۔ اقبال کے نزدیک انسان کامل کی خودی بقائے دوام حاصل کرتی ہے، مادے کو اقبال نے ایک ایسی روح قرار دیا ہے جو زماں و مکاں میں محصور ہے۔ درحقیقت یہی روح وحدت انسانی ہے جو نصب العین کی تلاش میں سرگرم عمل ہے اور اسی نصب العین کو زماں و مکاں میں متشکل کرنے کی آرزو دراصل قیام مملکت کا دوسرا نام ہے۔ (بحوالہ موضوعات فکر اقبال، پروفیسر سمیع اللہ قریشی، اقبال اکیڈمی لاہور، ص ۱۶)

اسلامی ثقافت کے بارے میں اقبال بڑی فکر انگیز بات کہتے ہیں۔ ان کے نزدیک اسلامی ثقافت کا مفہوم اس کے سوا کچھ نہیں کہ مشاہدات کے لیے زاویہ نظر بدلتے ہی تصورات کو نیا مفہوم مل جائے۔ کیونکہ اسلام بذات خود تحریک ہے جو ہر دور کے تغیرات کو اپنے اندر جذب کر کے تجربہ اور روایت کو نئے سرے سے منظم کرتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ قرآن محض عقیدہ کے بجائے عمل یعنی تجربہ پر زور دیتا ہے۔ ان کے نزدیک جب تک اسلام ایک تہذیبی قوت رہا مسلمان دنیا پر چھائے رہے، جوں ہی مذہب عقائد و رسوم کا ایک انبار بنا اشاعت اسلام اور اسلام کے تہذیبی افق کی وسعت کا عمل رک گیا۔ (موضوعات اقبال، ص ۱۱)

اقبال اپنے خطبات اور دیگر تحریروں میں جگہ جگہ قرآن حکیم سے اپنے گہرے تعلق کا اظہار کرتے ہیں۔ انہوں نے اپنے خطبات میں یہ کوشش کی کہ قرآن کے اس دعویٰ کو کہ وہ ایک مربوط جامع اور متحرک نقطہ نظر ہے ثابت کیا جائے۔ اقبال نے ثابت کیا کہ قرآن ایمان و تعقل کے درمیان کسی تفریق کا قائل نہیں۔ چنانچہ ان کے نزدیک مذہب اور سائنس کی منزل مقصود ایک ہے۔ اقبال ایک فلسفی تھے لیکن انہوں نے فلسفہ کو دین اور انسانی زندگی کے عملی مراحل سے ہم آہنگ بنا دیا اور خود فلسفہ پر اپنی اس تنقید کی اپنی تحریروں سے تردید کی ۔

ہے فلسفہ زندگی سے دوری ایام خرد سے بے حضوری
انہوں نے ثابت کیا کہ ایک فلسفی دین کے اصولوں کی پابندی کرتے ہوئے دین کے
افکار کی تشکیل و ترتیب نو میں حصہ لے کر اس کی آب و تاب بڑھا سکتا ہے۔ اس کے لیے وہ صرف
عقل پر بھروسہ کرنے کے بجائے وحی و الہام کی روشنی کا قدم آگے بڑھاتے ہیں۔ بقول
پروفیسر سمیع اللہ اقبال نے یہ ثابت کیا کہ دین کے اصولوں کی وضاحت فلسفہ کے تعاون سے کی
جاسکتی ہے۔

اقبال کے عہد میں قوم پرستی و وطن پرستی ایک عقیدہ بن کر مغرب کے اثرات کی وجہ سے
مسلمانوں کے ذہنوں پر بھی مسلط تھی اور یہ خیال عام تھا کہ اس عہد میں انسانوں کو یہی تصور بہتر
طریقہ سے مربوط کر سکتا ہے۔ کانگریس اور دیگر سیاسی و اجتماعی تحریکوں کا اس پر پختہ ایمان تھا۔
عالم اسلام بھی پورے طور پر اس کی گرفت میں تھا۔ اقبال نے اس تصور کی مخالفت کی، مولانا
حسین احمد مدنی کے خط کے جواب میں انہوں نے اختصار کے ساتھ اپنے موقف کی وضاحت ان
الفاظ میں کی:

”اگر عالم انسانیت کا مقصد اقوام متحدہ کا امن و سلامتی اور ان کی موجودہ ہیئتوں
کو بدل کر ایک واحد اجتماعی نظام قرار دیا جائے تو سوائے نظام اسلامی کے کوئی دوسرا
نظام ذہن میں نہیں آسکتا، کیونکہ قرآن سے میری سمجھ میں جو کچھ آیا ہے اس کی رو سے
اسلام محض انسان کی اخلاقی اصلاح ہی کا داعی نہیں بلکہ عالم بشریت کی اجتماعی زندگی
میں ایک تدریجی مگر اساسی انقلاب بھی چاہتا ہے جو اس کے قومی و نسلی نقطہ نظر کو یکسر بدل
کر اس میں خالص انسانی ضمیر کی تخلیق کرے۔“ (روزنامہ احسان، مارچ ۱۹۲۸ء)

علامہ اقبال نے مغرب میں جنم لینے والے جذبہ قومیت و وطنیت کو ان کی مجبوری قرار
دیا ہے کہ ان کے پاس کوئی عالم گیر سیاسی و اخلاقی نظام موجود نہ تھا اور مسیحی دنیا کو مر بوط کرنے کا
یہی نسخہ ان کی سمجھ میں آیا اور انہوں نے یہ تصور کر لیا کہ سیاسی اتحاد و اتفاق کا وجود عقیدہ وطنیت
کے تحت ہی ممکن ہے۔ علامہ نے اس باطل نظریہ پر اپنے ۱۹۳۰ء کے آل انڈیا مسلم لیگ کے خطبہ
صدارت میں کھل کر تنقید کی ہے اور اپنی متعدد نظموں میں وطنیت و قومیت پر نشتر چلایا ہے۔

جو کرے گا امتیاز رنگ و خوں مٹ جائے گا ترک خرگا ہی ہو یا اعرابی والا گھر
 نسل اگر مسلم کی مذہب پر مقدم ہوگئی اڑ گیا دنیا سے تو مانند خاک رہ گذر
 اپنی ملت پر قیاس اقوام مغرب سے نہ کر خاص ہے ترکیب میں قوم رسول ہاشمی
 ان کی جمعیت کا ہے ملک و نسب پر انحصار قوت مذہب سے مستحکم ہے جمعیت تری
 اقبال نے اپنے فکری نظام میں فلسفہ کے ساتھ سائنس کو خصوصی توجہ کا محور بنایا اور قرآن و
 حدیث کی روشنی میں سائنس کے منہاج غور و فکر کا مطالعہ کیا۔ بقول پروفیسر سمیع اللہ ”موحد ہونے
 کی بنیاد پر انہوں نے مادہ، انسان، ذہن اور زندگی کے ظاہری اختلاف میں حقیقت واحدہ کو تلاش
 کیا۔ ہر چند کہ انسانی تہذیب کے ان تینوں اداروں مذہب، فلسفہ اور سائنس کی زبان قواعد اور
 طریق کار میں کافی اختلاف موجود ہے تاہم اقبال قرآن کی روشنی میں ان تینوں میں کوئی تضاد
 محسوس نہیں کرتے کیونکہ ان کے نزدیک یہ تینوں انسان کے لیے حقیقت واحدہ کی تقسیم میں مدد و
 معاون ٹھہرتے ہیں اور ساتھ ہی ترقی پذیر انسانی تمدن کو مختلف مراحل طے کرانے کا باعث بنتے
 ہیں۔“ (موضوعات فکر اقبال، ص ۸۲)

اقبال کے نزدیک سائنٹفک انداز سے کائنات اور اس کی اشیاء کا مطالعہ اسلام کی ایک
 خاص عنایت ہے ۔

حکمت اشیاء فرنگی زادہ نیست اصل اوجز لذت ایجاد نیست
 چوں عرب اند را روم پر کشاد علم و حکمت را بنا دیگر نہاد
 دانہ آں صحرا نشیناں کاشتند حاملش افرنگیاں برداشتند
 عمیق مشاہدہ اور تجرباتی مطالعہ کا آغاز مسلمانوں نے کیا چنانچہ رابرٹ بریفالٹ اپنی
 مشہور کتاب "The Making of Humanity" میں لکھتے ہیں:

”آج یورپ میں جس سائنسی ترقی کا دور دورہ ہے اس کی بنیاد عربوں
 نے ہی استوار کی تھی، یونانی تو تجرباتی اصول سے بالکل نا آشنا تھے۔“ (بحوالہ محمد
 رفیع الدین، حکمت اقبال، لاہور، ص ۲۱۷)

مشہور فرانسیسی سائنس داں سیڈیلو بھی اس کی تائید کرتا ہے:

”وہ (عرب) معلوم سے نامعلوم کی طرف آتے تھے اور کسی ایسی بات کو سچ نہ مانتے تھے جس کی تائید و توثیق ذاتی تجربہ یا تجربہ گاہ سے نہ ہوتی۔ سائنس کے مسلمان استادوں نے ان ہی اصولوں کی تعلیم دی اور ان ہی کا دعویٰ کیا۔“
رسالہ اسلامک ریویولنڈن کے مارچ ۱۹۵۵ء کے شمارے میں جان ڈبلیو کیمپبل جو نیئر اعتراف کرتے ہیں:

”ہم نے سائنس کی میراث روماسے لی ہے نہ یونان سے بلکہ اسلام سے لی ہے۔“

اقبال بیسویں صدی میں ان نمایاں مفکرین میں ہیں جنہوں نے فکر انسانی کی نشوونما میں آزادی کے ساتھ نقد و تنقید کا دروازہ کھلا رکھنے کی حمایت کی۔ وہ تصوف پر اس لیے معترض تھے کہ وہ غور و فکر کے دروازے بند کر دیتا ہے۔ ڈاکٹر سید عبداللہ کے ساتھ ایک گفتگو میں اقبال نے یہ تسلیم کیا:

”وہ فلسفہ اور مذہبی تعلیم جو انسانی شخصیت کی نشوونما کے منافی ہو بیکار چیز ہے، تصوف نے سائنٹفک روح کو بہت نقصان پہنچایا ہے۔ گوش و چشم کو بند کرنا اور صرف چشم باطن پر زور دینا جمود و انحطاط ہے۔ قدرت کی تخیل کی جگہ سہل طریقوں کی تلاش ہے، خالص اسلامی تصوف یہ ہے کہ احکام الہی انسان کی اپنی ذات کے لیے احکام بن جائیں۔“ (ملفوظات اقبال، محمود نظامی، ص ۱۶۲)

اقبال نے کائناتی اسرار کا انکشاف ایک مسلمان کی اولین ذمہ داری قرار دی۔ مذہب و سائنس کا مستقبل ان کے نزدیک ایک سا ہے اور انہوں نے پروفیسر سمیع اللہ قریشی کے الفاظ میں مذہبی تجربے کے لیے عمل کا وہی معیار مقرر کیا جو سائنسی تجربہ کے اثبات کے لیے عقل ٹھہراتی ہے۔ اقبال ہمیں مذہب کے معاملہ میں جس شعور سے آشنا کراتے ہیں وہ سائنسی حقائق کا ہی بخشنده شعور ہے۔ (موضوعات فکر اقبال، ص ۸۵)

۱۹۱۱ء میں آل انڈیا محمدن ایجوکیشنل کانفرنس کے صدارتی خطبہ میں انہوں نے فرمایا:

”میں دعوے سے کہہ سکتا ہوں کہ اسلام مغربی تہذیب کے تمام عمدہ

اصولوں کا سرچشمہ ہے۔ یورپ میں علم کا پندرہویں صدی میں چرچا مسلمانوں ہی کی یونیورسٹیوں سے ہوا۔“

۱۹۱۰ء میں آغاز سرما میں اسٹریچی ہال ایم اے او کالج علی گڑھ میں علامہ نے اپنے خطبہ بہ عنوان ملت بیضا پر ایک عمرانی نظر میں مسلمانوں کے دور اول کا ذکر ان الفاظ میں کیا:

”اس دن سے جب کہ اسلام کا سنگ بنیاد رکھا گیا سولہویں صدی کے آغاز تک یعنی تقریباً ایک ہزار سال کا زمانہ اس بے چین قوم نے ملک گیر یوں اور جہاں کشائیوں میں صرف کیا، اگرچہ اس ہمہ گیر مشغلہ میں منہمک ہونے کے باعث انہیں کسی دوسرے شغل کی فرصت نہ ہو سکتی تھی لیکن پھر بھی اسلامی دنیا نے علم و حکمت کے قدیم خزانوں کو ڈھونڈھ نکالا اور ان پر اپنی طرف سے معتد بہ اضافہ کر کے ایک عظیم النظیر لٹریچر کا سرمایہ دنیا کے سامنے پیش کیا اور ایک ایسا جامع و مانع نظام فقہ مدون کیا جو اسلامی تمدن کا غالباً سب سے گراں مایہ ترکہ ہے۔ مسلمانوں کی تہذیب و شائستگی کا معیار بھی عالم گیر ہے۔“ (ملت بیضا پر ایک عمرانی نظر، علامہ اقبال مترجمہ مولانا ظفر علی خاں، اقبال اکیڈمی لاہور)

اقبال اس خطبہ میں ایک ایسی یونیورسٹی کا خواب دیکھتے ہیں جو اسلامی فکر و نظر اور اسلامی تہذیب کو فروغ دے۔ وہ فرماتے ہیں ؎

”کوئی قوم اس رشتہ کو یک بیک نہیں توڑ سکتی جو اسے ایام گذشتہ سے جوڑے ہوئے ہے اور مسلمان کے لیے تو اس تعلق کو چھوڑ دینا اور بھی محال ہے۔ مسلمان کو بے شک علوم جدیدہ کی تیز رفتار کے قدم بہ قدم چلنا ہے لیکن یہ بھی ضرور ہے کہ اس کی تہذیب کا رنگ خالص اسلامی ہو۔ اخلاق و مذہب کی تلقین کے لیے موجودہ زمانہ کے مبلغ کو تاریخ اقتصادیات اور عمرانیات کے حقائق عظیمہ سے آشنا ہونے کے علاوہ اپنی قوم کے لٹریچر اور تخیل میں پوری دسترس رکھنی چاہیے۔“

(ملت بیضا پر ایک نظر، ص ۲۴)

اقبال زندگی کے آخری دور میں مسلسل مسلمانوں کے مغرب کے بالمقابل اپنے پیروں

پر کھڑے ہونے اور اپنی متاعِ گم شدہ یعنی علم و حکمت کی بازیافت کرنے کی تمنا کا اظہار کرتے رہے اور اس کے لیے اہل علم میں ذوق طلب و شوق جستجو پیدا کرنے کی کوشش کرتے رہے۔ زندگی کے آخری ایام میں وفات سے کچھ ہی دنوں پہلے ۱۹ مارچ ۱۹۳۸ء کی ایک گھریلو نشست میں انہوں نے فرمایا:

”مسلمانوں کا علمی ورثہ بڑا عظیم اور قابلِ فخر ہے۔ علم و حکمت کی کوئی شاخ نہیں ہے جس پر ان کی ذہانت و اجتہاد کا نقش ثبت نہ ہو۔ یہ مسلمان ہی تھے جنہوں نے صحیح معنوں میں علمی روح پیدا کی اور علوم و فنون کو ان کے اصل راستے پر ڈال دیا۔ علم کا وجود جسے آج کل سائنس کہتے ہیں انہی کا مرہونِ منت ہے۔ یہ اسلام ہی تھا جس نے وہ شرائط بہم پہنچائیں جن پر علم کی ترقی اور نشو و نما کا دار و مدار ہے۔ یہ شرائط کیا تھیں؟ مشاہدہ، معائنہ فکر و نظر محسوس اور غیر مرئی کا احترام، تجربہ و تحقیق، تفتیش، حقائق کا اثبات، ان کا مطالعہ اور ان کی مسلسل تاویل و تعبیر۔ یہ شرائط یوں نہ ہوتیں تو علم کا راستہ دیر تک رکا رہتا۔“۔ اقبال کے حضور میں، سید نذیر نیازی، جزء اول، کراچی، جولائی ۱۹۷۱ء، ص ۳۷۷

اقبال کو اس بات پر بے حد تشویش تھی کہ ”آج مسلمانوں میں علمی تجسس کا فقدان ہے۔ عالم اسلام کا ذہنی انحطاط حد درجہ اندوہناک ہے۔ مسلمانوں میں علمی روح باقی ہے نہ علم و حکمت سے کوئی دلی شغف۔ وہ علم و حکمت کی صحیح روح کو سمجھتے ہیں نہ اس کے ماضی کے عہد بہ عہد ارتقاء انقلابات اور تغیرات کو۔ اگر کچھ ہے تو تقلید یا پھر یورپ سے چند ایک مستعار لیے ہوئے خیالات کا اعادہ۔“

اپنی زندگی کی آخری مجالس میں انہوں نے حسرت سے اپنے اس درد و کرب کا اظہار کیا:

”جس مایوسی و دل گرفتگی میں آج کل دنیا گرفتار ہے اور جس کے زیر اثر انسانی تہذیب کو ایک زبردست خطرہ لاحق ہے اس کا علاج نہ تو عہدِ وسطیٰ کی صوفیانہ تحریک سے ہو سکتا ہے نہ جدید زمانہ کی وطنیت اور لادینی اشتراکی تحریکوں سے۔ اس وقت دنیا کو حیات نو کی ضرورت ہے۔ اگر عصر حاضر کا انسان دوبارہ وہ

اخلاقی ذمہ داری اٹھائے گا جو جدید سائنس نے اس پر ڈال رکھی ہے تو صرف مذہب کی بدولت۔ صرف اسی طرح اس کے اندر ایمان و یقین کی کیفیت کا احیاء ہوگا جس کی بدولت وہ اس زندگی میں ایک انفرادیت پیدا کرتے ہوئے آگے چل کر بھی اسے محفوظ اور برقرار رکھ سکے گا۔ (بحوالہ موضوعات فکر اقبال، ص ۱۰۹)

علامہ نے اسلامی فکر و فلسفہ کی گہرائیوں میں اتر کر اس کے امتیازات پر بڑی تفصیل سے اپنے خطبات میں روشنی ڈالی ہے۔ علامہ کے نزدیک ایک کامیاب زندگی کے لیے ہماری عملی کشمکش وہی رنگ اختیار کر لے گی جیسا ہمارا اخلاق اور روحانی نصب العین لیکن جس میں ہم اپنے غور و تفکر اور واردات باطن کے ساتھ واقعیت کی اس دنیا سے منہ نہیں موڑیں گے جو محسوس حقائق اور لحظہ بہ لحظہ بدلتے ہوئے واقعات و حوادث کی شکل میں ہمارے سامنے آتی اور جواباً کسی عمل پر مجبور کرتی ہے۔ (تشکیل جدید الہیات اسلامیہ، ص ۲۶)

علامہ چاہتے تھے کہ اپنے تاریخی افکار کو غیر اسلامی عناصر سے پاک کر کے وہ روایات از سر نو قائم کریں جن کا تعلق خالصاً اسلامی فکر سے ہے۔ علامہ محسوس کرتے تھے کہ مغرب نے مسلمانوں کی تاریخ فلسفہ کو بڑے گمراہ کن انداز میں پیش کیا اور ثابت کرنے کی کوشش کی کہ مسلمانوں کا کوئی فکری نظام ہی نہیں جبکہ حقیقت یہ ہے کہ اسلام نے علم و عمل کی دنیا میں ایک بنیادی اور ہمہ گیر انقلاب پیدا کر دیا۔ ضرورت ہے کہ اپنے تاریخی افکار کو غیر اسلامی عناصر سے پاک کریں اور وہ روایات از سر نو قائم کریں جن کا تعلق خالصاً اسلامی فکر سے ہے۔ اقبال مسلمانوں کے دور زوال میں بھی اسلامی فکر کے ارتقاء کے تسلسل کو محسوس کرتے اور اسے بیسویں صدی اور اس کے بعد بھی جاری رکھنے کے لیے نوجوان مفکرین کی تربیت کے آرزو مند تھے۔ اسی اسلامی فکر کی تشکیل جدید کی فکر اور اس کے لیے اسلامی دنیا کے دانشوروں کو بیدار کرنے کی عرض سے انہوں نے اپنے مشہور خطبات مرتب کیے جو مدراس، حیدرآباد اور علی گڑھ میں پیش کیے گئے، جن میں شعور انسانی کی کامل بیداری کا پیغام پنہاں ہے۔ اقبال کے مطالعہ قرآن نے یہ حقیقت ان پر منکشف کی تھی کہ اسلام سمع، بصر، فواد و قلب کے ساتھ ساتھ بار بار فکر اور علم پر زور دیتا ہے جسے نظر انداز نہیں کیا جاسکتا۔ قرآن غورو تفکر کا سرچشمہ ہے۔ نذیر نیازی کے الفاظ میں اقبال چاہتے تھے کہ تعلیمات قرآنی پر ہم اپنے

ذہن کو مرتکز کر کے یہ معلوم کریں کہ اسلام کا مٹح نظر عالم انسانی کے بارے میں کیا ہے وہ ہم سے کس قسم کی زندگی کا طالب ہے۔ ہمارے اخلاقی و مادی نشو و نما کے ساتھ ساتھ حیات فرد اور استحکام جماعت کی طرح تہذیب انسانی کے حفظ و ارتقاء کی اساس کن اصولوں پر رکھتا ہے، لہذا بحیثیت ایک جامع و ہمہ گیر تحریک کے اس کا ماضی کیا ہے، حال و مستقبل کیا ہے ہماری حیات ملی کا گذر کن کن مراحل سے ہوا، وہ کیا مشکلات تھیں جو ہمیں اپنے ثقافتی نصب العین اور مذہبی اور روحانی زندگی کے اظہار میں پیش آئیں، ہماری میراث علم و حکمت اور سرمایہ ادب کیا ہے، ہم نے تاریخ عالم کا رخ کس طرف موڑا، یہ کیسے ممکن ہے کہ ہم حسب سابق ان قوتوں کو پھر سے اپنے تصرف میں لائیں جو تقدیر انسانی کی صورت گر ہیں اور جس کے بغیر ہمارے اخلاق و روحانیت ہی کے کچھ معنی ہیں نہ اعمال و عقاید کے۔ (تشکیل جدید الہیات اسلامیہ، مقدمہ، ص ۳۱)

اقبال اس باب میں واحد رہنمائی قرآن سے حاصل کرنے کا مشورہ دیتے ہیں کہ قرآن کا مطالعہ بحیثیت ایک رہنما کتاب کے کریں نہ کہ پہلے سے قائم شدہ افکار و تصورات کی روشنی میں۔ اقبال قرآن کو ایسا دستور حیات قرار دیتے ہیں جس کی تکمیل حضور اکرمؐ کے مقدس ہاتھوں سے اس طرح ہوئی کہ صدیوں کے زوال و انحطاط کے باوجود اس کی اصل حقیقت نہ کبھی ارباب بصیرت سے چھپ سکی نہ عالم اسلام کی تاریخ ان ہستیوں سے خالی رہی جن کی زندگی کا مقصد ہی یہ تھا کہ عملاً اس کے قیام و بقا کی سعی کرتے رہیں۔ قرآن حکیم سے اس وقت بھی عالم انسانی کی تقدیر وابستہ ہے۔ اقبال کو اس بات پر تشویش ہے کہ اس وقت فتنہ استشراف اور زوال علم کی وجہ سے خود مسلمان قرآن کی صحیح روح سے غافل ہو گئے ہیں اور اپنے ماضی سے بیزار اور مستقبل سے مایوس ہیں۔ نذیر نیازی کے الفاظ میں اقبال کو اس بات کا شدید احساس تھا کہ ہم جس فضا میں سانس لے رہے ہیں وہ مغربی تعلیم اور مغربی تہذیب و تمدن کے تصرف و استیلا کے باعث ان خیالات سے معمور ہے جن پر علم حاضر کی انتہاء ہوئی ہے، علم و حکمت کی تاریخ یا تہذیب و تمدن کا کوئی منظم اور مربوط بیان ہے تو وہی جوابل مغرب پیش کرتے ہیں۔ ہمارے پاس کچھ ہے تو چند متفرق اور منتشر حقائق، چند ادھورے اور بے ربط نظریات اور اس لیے ہمارا غور و فکر اور ہمارا ذوق تجسس بالآخر وہی راستہ اختیار کر لیتا ہے جو دانا یا ن فرنگ کا ہے۔ اس لیے ہم وہ سب نتائج قبول کر لیتے ہیں جو مغربی علم و

فضل نے ہمارے ماضی کی تعبیر میں قائم کر رکھے ہیں۔

علامہ چاہتے تھے کہ ہم اس علم و فضل سے آگے بڑھنے کی کوشش کریں اور ابداع سے کام لیں۔ ہمیں فکر مستعار اور فکر خلاق میں فرق کرنا ہوگا۔ اخذ و اکتساب سے آگے بڑھ کر ماضی و حال پر نقد و تفتیش سے نظر ڈالنا اور شان اجتہاد سے آگے بڑھنا ہوگا۔

علامہ کے اندر نذیر نیازی کے الفاظ میں قرآن حکیم کی تعلیمات نے وہ نظریہ پیدا کی جس نے ان حقائق کا اعتراف کرتے ہوئے جو ہمارے شعور ذات اور علم و عمل کا نقطہ آغاز ہیں ایک ایسے فکر کی طرح ڈالی جس کی شان خلاقی اور جامعیت کا یہ عالم ہے کہ اس نے حقیقت کا ایک تصور پیش کیا ہے جو ان نقائص سے پاک ہے جو مختلف نظامات فلسفہ میں بالعموم موجود ہیں اور انہیں واقعیت سے دور کر دیتی ہیں۔ خوبی یہ ہے کہ علامہ مشرق و مغرب کی تاریخ فلسفہ اور تہذیب و تمدن پر پوری نظر رکھتے ہیں اور وہ اپنے نتائج فکر کو جدید زبان میں پیش کرتے ہیں۔

اقبال اپنے خطبات کے دیباچے میں واضح الفاظ میں لکھتے ہیں کہ قرآن فکر کے بجائے عمل پر زور دیتا ہے۔ اقبال ان صوفیہ کی خدمات کا بھی اعتراف کرتے ہیں جنہوں نے دور اول میں ”مسلمانوں میں مذہبی احوال و واردات کی تشکیل اور رہنمائی میں بڑی قابل قدر خدمات انجام دی ہیں۔ لیکن آگے چل کر جو حضرات اس میدان میں تھے وہ موجودہ دنیا کے افکار و تجربات سے کوئی فائدہ نہیں اٹھا سکے۔ اقبال کے نزدیک عصر حاضر میں کسی ایسے منہاج کی ضرورت ہے جو عضویاتی اعتبار سے شدید بدنی ریاضت کا طالب نہ ہو مگر نفسیاتی اعتبار سے اس ذہن سے قریب تر ہو جو گویا محسوس کا خوگر ہو چکا ہے تاکہ وہ اسے بہ آسانی قبول کر لے..... یعنی مذہب کی بدولت ہمیں جو علم حاصل ہوتا ہے اسے سائنس کی زبان میں سمجھا جائے“۔ (ص ۳۵، تشکیل جدید)

غرض علامہ نے گذشتہ صدی میں مسلمانوں کی فکری دنیا میں ایک انقلاب پیدا کیا جو سرسید کی علی گڑھ تحریک سے کہیں زیادہ انقلاب آفریں تھا اور جس سے فکر و خیال اور عملی انقلاب کے متعدد چشمے پھوٹ پڑے، جس کا متعدد اہل قلم نے مفصل طور پر جائزہ لیا ہے۔

مولانا شبلیؒ کے فارسی خطوط

جناب ساجد صدیق نظامی

شبلی کی جامع کمالات شخصیت بھلا کس گوشہٴ علم سے آشنا نہ تھی۔ سیرت و سوانح نگاری، انشا پر دازی اور شاعری پر عبور کامل کے ساتھ عربی و فارسی زبان و ادب کا کامل فہم، ملت اسلامیہ اور مسلمانانِ ہند کو پیش آمدہ مسائل کا ادراک اور مستقبل میں منصوبہ بندی کی ضرورت پر توجہ، صحت مند علمی رجحانات کے فروغ کا احساس۔ یہ سب وہ میدان ہائے کار ہیں جو شبلی کی طبع نادر کی جولان گاہ تھے۔ شبلی نعمانی کے علمی کار ہائے نمایاں کی ایک طویل فہرست ہے۔ ان کی متعدد کتب آج بھی اپنے موضوع پر مستند تسلیم کی جاتی ہیں۔ شیخ محمد اکرام نے لکھا ہے کہ:

”شبلی نے اپنے وقت کا بہترین استعمال کیا۔ ان کے عظیم کارناموں کا راز ان کی ترقی پذیری میں ہے۔ ”اسکات المعتقدی“ سے ”سیرت النبیؐ“ تک علمی، ادبی اور ذہنی ارتقا کی جو منزلیں ہیں، انھیں وہی شخص طے کر سکتا تھا جسے مسلسل یہی جستجو ہو کہ ”خوب سے ہے خوب تر کہاں“۔ (۱)

پھر لکھتے ہیں:

”مولانا شبلی کی زندگی میں سبق اور ہمت آموزی کا بڑا سامان ہے۔ خوش قسمت تھے وہ لوگ جو ان سے براہِ راست فیض یاب ہوئے، لیکن علامہ کا اصل سرمایہٴ حیات صفحہٴ قرطاس پر ثبت ہے، اس سے مستفید ہونے کا ہمیں بھی پورا موقع حاصل ہے۔“ (۲)

شبلی کے علمی کارناموں کے ساتھ ساتھ شبلی کی شعری صلاحیت بھی ان کی شخصیت کا ایک

لیکچرر، گورنمنٹ اسلامیہ کالج برائے طلباء، لاہور کینٹ۔

اہم رخ ہے۔ شبلی نے اردو و فارسی شاعری (غزل، نظم، قصیدہ) میں ایک قابل لحاظ حصہ یادگار چھوڑا ہے۔ شبلی کی اردو و فارسی شاعری کے مجموعے اس بات کی شہادت دیتے ہیں۔ علی گڑھ قیام کے دوران فارسی میں لکھے گئے قصائد اور منظومات بھی اسی ضمن میں آتے ہیں۔

شبلی کی تخلیقی شخصیت کا ایک رخ ان کی مکتوب نگاری بھی ہے۔ شبلی کے مکاتیب کا ایک مجموعہ مولانا سید سلیمان ندوی نے دو حصوں میں مرتب کر کے بالترتیب ۱۹۱۶ء اور ۱۹۱۷ء میں شائع کیا۔ اس کے علاوہ محمد امین زبیری نے شبلی کے مکاتیب کا ایک مجموعہ ”خطوط شبلی“ کے نام سے بھی شائع کیا۔ ان مجموعوں میں شامل مکاتیب، شبلی نعمانی کی شخصیت کے بہت سے گوشوں پر روشنی ڈالتے ہیں، کئی پہلوؤں کو نمایاں کرتے اور کئی امور سے پردہ اٹھاتے ہیں۔ اس کے ساتھ ساتھ یہ مکاتیب شبلی کی تخلیقی شخصیت کو سمجھنے میں مددگار رہتے ہیں۔ شبلی کے خطوط سے متعلق تفصیلی اظہار خیال مولانا سید سلیمان ندوی نے اپنے مرتبہ مجموعے کے حصہ اول کے دیباچے میں کیا ہے۔ اسی دیباچے میں مہدی افادی کا مفصل تجزیہ بھی شامل ہے۔ اس دیباچے کا مطالعہ شبلی کے خطوط کی افادیت ثابت کرنے میں بڑا معاون ثابت ہوتا ہے۔

مولانا سید سلیمان ندوی کے مرتبہ مجموعہ مکاتیب میں شبلی کے اردو خطوط کے ساتھ ساتھ فارسی مکاتیب بھی جمع کیے گئے ہیں۔ شبلی کے اردو خطوط کے ساتھ ساتھ فارسی خطوط کا جائزہ لینا بھی ضروری ہے۔ اردو خطوط کے مطالعے تو ہوتے آئے ہیں مگر فارسی خطوط کو معتد بہ توجہ نہیں مل سکی۔ اس مضمون میں شبلی کے فارسی خطوط کا ہی جائزہ لیا جائے گا۔

یہ بات قابل ذکر ہے کہ شبلی علی گڑھ آمد (۱۸۸۳ء) سے قبل اپنی بیشتر خط و کتابت فارسی میں کیا کرتے تھے۔ مولانا فیض الحسن سہارنپوری سے کسب فیض کے لیے لاہور آئے تو والد سے خط کتابت فارسی میں کی۔ اسی دور میں اپنے چچا، بھائی اور دوستوں کو خطوط لکھے تو فارسی میں۔ اسی فارسی مکتوب نگاری کے بارے شیخ محمد اکرام کا تبصرہ یہ ہے کہ ”وہ ابھی بیس برس کے ہیں اور دس روپے کی محافطی کے لیے ہاتھ پاؤں مار رہے ہیں لیکن خط لکھیں گے تو فارسی میں“۔ (۳) شبلی کے ہاں فارسی مکتوب نگاری کا یہ سلسلہ جون ۱۸۸۴ء تک رہا ہے۔ اس کے بعد فارسی کے چند خطوط ہیں مگر وہ بہت ہی کم ہیں اور صرف دو ایک اصحاب کو لکھے گئے ہیں۔ ایک خط شبلی کے قیام

ندوہ کے زمانے کا ہے جو شبلی نے سر آغا خان کو لکھا تھا۔ یہ خط سے زیادہ ایک دعوت نامہ ہے جس میں طلبائے ندوہ کی تعلیمی استعداد ملاحظہ کرنے کے لیے دعوت دی گئی ہے۔ اس خط نما دعوت نامے کی تحریر فارسی زبان میں اس وجہ سے ہے کہ اس دور میں اردو کے عام چلن کے باوجود طبقہ اشرافیہ کی زبان فارسی ہی تھی۔

جس دور میں شبلی علی گڑھ سے منسلک ہوئے وہ فارسی کی جگہ اردو کی عام مقبولیت کا دور تھا۔ شبلی چونکہ ۱۸۸۳ء میں علی گڑھ کے مدرسۃ العلوم میں آگئے تھے اور علی گڑھ کے اصحاب اپنا علمی سرمایہ زبان اردو ہی میں پیش کر رہے تھے۔ اس وجہ سے بھی ۱۸۸۴ء کے بعد شبلی کے فارسی خطوط بہت کم نظر آتے ہیں۔ اس بات کا اندازہ اس امر سے لگایا جاسکتا ہے کہ شبلی نے اپنی ابتدائی تعلیمی زندگی میں والد کے نام خطوط فارسی میں قلم بند کیے ہیں لیکن علی گڑھ آمد کے بعد جو خطوط اپنے والد کو لکھے وہ اردو میں ہیں۔ سید سلیمان ندوی کے مرتبہ مجموعہ مکاتیب میں فارسی کے ۲ خطوط ہیں جبکہ ۲ خطوط اردو میں ہیں جو شبلی نے اپنے والد کو لکھے ہیں۔ یہ ۱۸۸۷ء سے ۱۸۹۲ء تک کے ہیں۔ تین خطوط قسطنطنیہ سے لکھے گئے ہیں۔ اسی طرح شبلی کا ایک خط چچا کے نام فارسی میں ہے، یہ علی گڑھ آمد کے کچھ ہی عرصے بعد لکھا گیا ہے۔ جب کہ اس کے بعد چچا کے نام تمام خطوط اردو میں ہیں۔

یہی کچھ مولوی حمید الدین (۴) کے سلسلے میں نظر آتا ہے۔ ان کے نام ۱۸۸۴ء تک فارسی کے صرف ۲ خط موجود ہیں۔ مگر بعد میں خط کتابت کا یہ سلسلہ اردو میں نظر آتا ہے اور یہ ۷۷ خطوط ہیں۔ صرف ایک استثناء مولوی محمد سمیع (۵) کے معاملے میں ہے۔ شبلی انھیں آخر تک فارسی اور اردو دونوں میں خط لکھتے رہے۔

درج بالا حقائق اس بات پر دلالت کرتے ہیں کہ علی گڑھ میں ملازمت کے دوران من جملہ دیگر اثرات کے جو شبلی پر مرتب ہوئے، ایک اثر یہ بھی ہوا کہ شبلی فارسی انشاء پردازی سے ہاتھ اٹھا کر اردو انشاء پردازی کی جانب متوجہ ہوئے۔

شبلی کے یہ فارسی خطوط تعداد میں (۳۳) تینتیس ہیں۔ جن اصحاب کو یہ لکھے گئے ہیں ان کے اسماء ذیل میں درج کیے جاتے ہیں۔ نام کے سامنے ان کے نام خطوں کی تعداد بھی درج

کردی گئی ہے۔

- ۱۔ شیخ حبیب اللہ، (۶) والد محترم ۲ خط ۲۔ شیخ عجیب اللہ، (۷) چچا ایک خط
 ۳۔ مہدی حسن، بھائی (۸) ۳ خط ۴۔ حکیم محمد عمر (۹) ۳ خط
 ۵۔ مولوی حمید الدین ۲ خط ۶۔ مولوی محمد عمر (۱۰) ۸ خط
 ۷۔ مولوی محمد سمیع ۱۱ خط ۸۔ اکبر صاحب ایک خط
 ۹۔ فرحت احمد ایک خط ۱۰۔ سر آغا خاں ایک خط

ان خطوط میں ایک خاص قسم کا رکھ رکھاؤ نظر آتا ہے اور محسوس ہوتا ہے کہ شاید شبلی نے دل لگا کر نہایت توجہ سے انھیں قلم بند کیا ہے۔ شیخ محمد اکرام کے نزدیک: ”شبلی کے احتیاط قلم کی ایک خاص وجہ تھی، انھیں شروع ہی سے اپنی قابلیت اور صلاحیتوں پر اعتماد تھا“۔ (۱۱)
 اردو خطوط کے برعکس شبلی فارسی خطوط میں آغاز میں مکتوب الیہ کے لیے توصیفی کلمات ذرا زیادہ استعمال کرتے نظر آتے ہیں۔ شبلی کے اردو خطوط برادر م، عزیز م، مکر م، برادر عزیز اور تسلیم جیسے الفاظ سے شروع ہوتے ہیں۔ جبکہ فارسی خطوط میں یار دناواز، مایہ ناز م، برادر اعظم صاحب، یار گرامی مدظلہ السامی، ایسے القاب دکھائی دیتے ہیں۔ جو خطوط والد کے نام ہیں ان میں مکر م خدمت جناب والد ماجد، اعلیٰ حضرت کے القاب استعمال کیے ہیں۔ چچا کو خط لکھتے ہوئے عم مکر م فیضہ، تسلیم و نیاز اور بھائی مہدی حسن کے نام خط میں ان کے نام کی مناسبت سے آغاز میں مہدی باللہ کا لقب لکھا ہے۔ اسی طرح ان ہی کے نام ایک خط کو ”عزیز من مسٹر مہدی حسن ابتیک اللہ بنّا حسناً“ سے شروع کیا ہے۔

اگر اردو خطوط میں دیکھیں تو شبلی نے والد کے نام خط محض ”قبلہ ام“ سے شروع کیے ہیں اور چچا کے نام خط ”جناب من“ سے شروع ہو رہے ہیں۔ انھی توصیفی و تمہیدی کلمات کے فرق سے شبلی کے فارسی و اردو خطوط کے اسلوب کے اولین فرق کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔

یہ خطوط چونکہ زیادہ تر شبلی نعمانی کے علی گڑھ آنے سے قبل کے ہیں لہذا ان میں شبلی کی ابتدائی زندگی اور اس دوران پیش آمدہ مشکلات و واقعات کے اشارے بھی کثرت سے نظر آتے ہیں۔ مثلاً پہلا خط اس وقت کا ہے جب شبلی نے ابتدائی تعلیم حاصل کرنے کے بعد مختلف اصحاب

علم سے مستفید ہونے کا ارادہ کیا جب کہ ان کے والد اس بات پر راضی نہ تھے۔ شبلی نے عربی کی تعلیم کے لیے مولانا فیض الحسن سہارنپوری سے فیض حاصل کرنے کا سوچا اور لاہور کے لیے نکل پڑے۔ مولانا فیض الحسن ان دنوں اورینٹل کالج، پنجاب یونیورسٹی میں پڑھاتے تھے۔ شبلی کی جیب میں تب پچیس روپے تھے۔ دو ماہ بعد جب یہ رقم ختم ہو گئی تو شبلی نے مجبوری کے عالم میں اپنے والد کو خط لکھا:

”مکرمی خدمت جناب والد ماجد،

مرادو ماہ می گذرد کہ ترک وطن کردہ ام، و بہ بیگانگان بسر بردہ ام، پیست و پنج روپیہ عنایت شدہ بود، سہ روپیہ بہ کرایہ یکہ از اعظم گڑھ تاجونپور رفت و ہفت روپیہ صرف ریل تا بہ سہارن پور شد، و پنج روپیہ از آنجا تا بہ لاہور، دہ روپیہ باقی می ماند، اول کہ درینجا رسیدم دو یک روپیہ بخوانج ضروریہ کہ در وقت قیام جائے پیش می آید، صرف شد، و چون درینجا جائے قیام نبود، مکانے بکرایہ یک روپیہ گرفتم، دو ماہ را دوروپیہ کرایہ می شود، آنچہ باقی می ماند بصرف طعام آمد، اگر انصاف رود بچند ان کفایت بسر بردہ ام کہ بیش از و متصور نیست، چون مزاج عالی اند کے برہمی داشت، از تکلیف ارسال صرف باز ماندم، اکنون کار مشکل افتاد است، دیگر چہ گویم تاخیر آزار تمام باعث، خواہد بود۔

حدادب

شبلی نعمانی ۱۲۸۹ھ“ (۱۲)

شبلی کی زندگی کی اس حقیقت پر تبصرہ کرتے ہوئے سید سلیمان ندوی کا کہنا ہے کہ: ”اس خط سے اندازہ ہوتا ہے کہ طلب علم کی راہ میں دل دادگانِ کمال کو کیا کیا صعوبتیں اٹھانی پڑتی ہیں۔“ (۱۳)

لاہور کے اس سفر کے بعد شبلی مولانا فیض الحسن سہارنپوری کے ساتھ سہارنپور چلے گئے کیونکہ مولانا تعطیلات کے باعث اپنے آبائی وطن جا رہے تھے۔ شبلی نے والد کے نام دوسرے خط میں اسی واقعے کا ذکر کیا ہے:

”در چند روزے مدرسہ اینجا تعطیل خواہد یافت، تعطیل تا دو ماہ خواہد

ماند۔ حضرت استاذ بطن خویش یعنی سہارن پور تشریف خواہند برد، این قدر ناغہ

نتوان کرد، مرا ہم عزم سہارن پور است۔“ (۱۴)

اسی خط سے اندازہ ہوتا ہے کہ شبلی نے قیام لاہور کے دوران اپنے والد کو گلستان روانہ کی تھی جو شاید انھیں موصول نہ ہو پائی۔ اس کا ذکر یوں کیا ہے:

”در قریب روزگارے عریضہ مع گلستان مطبوعہ لندن ارسال خدمت

کرده ام، اگر نرسیدہ است از نارسائی بخت است۔ مراد این میان جرے

نیست۔“ (۱۵)

گلستان، مطبوعہ لندن، والد کو بھجوانے کی ایک وجہ یہ بھی ہو سکتی ہے کہ ان حالات میں شبلی کو والد کی تالیف خاطر مقصود ہو۔

ان ہی خطوط میں شبلی کی ابتدائی زندگی کے متعلق ایک اور اہم واقعے کا اشارہ ملتا ہے۔ شبلی فارغ التحصیل ہو کر اعظم گڑھ میں قیام پذیر ہو گئے تھے۔ یہ ۱۸۷۷ء کا زمانہ تھا۔ ان ہی دنوں روس اور سلطنت عثمانیہ کی جنگ چھڑ گئی تو برصغیر کے مسلمان بھی اس واقعے سے مضطرب ہوئے۔ ہندوستان میں جگہ جگہ سلطنت عثمانیہ کی حمایت میں جلسے ہوئے اور چندے اکٹھے کیے گئے۔ شبلی بھی اس فضا سے متاثر ہوئے اور اعظم گڑھ میں سلطنت عثمانیہ کی مدد کے لیے چندہ اکٹھا کرنے کی مہم شروع کی۔ اس مہم میں شبلی اعظم گڑھ کی اس انجمن کے سیکرٹری مقرر کیے گئے جو یہ تمام مہم سر انجام دے رہی تھی۔ کتنا چندہ ہوا یہ شبلی کے اس خط سے معلوم ہوتا ہے جو انھوں نے اپنے دوست حکیم محمد عمر کو لکھا تھا۔ خط میں لکھتے ہیں:

”چندہ این شہر تا بہ دو ہزار و شش صد رسید، امید قوی است کہ از سہ

ہزار بیشتر گردد آید۔“ (۱۶)

اسی خط میں ایک ترکی سالار عثمان پاشا کی بھی از حد تعریف کی گئی ہے۔ لکھتے ہیں:

”سپاس ایزد کہ روسیان بتہ کار در روز پیکار کہ با عثمان پاشا کردہ بودند

ہشت ہزار طعمہ جیم شدند و بیست و چہار ہزار زخمیہاے گران برتن برداشتہ بر بستر

خاک تپیدند، نسیم فتح و ظفر بر پرچم علم سلطانی وزید و برادر شاہ روس گرینڈ ڈیوک

نکلسن از بیم ضربت دلیران ترک از میان رمید۔ (۱۷)

جو چندہ ترکی بھیجا گیا تھا، وہ کس کے توسط سے گیا تھا، اس کی نشاندہی شبلی کے سفرنامہ ترکی و مصر سے ہوتی ہے۔ اس میں لکھتے ہیں:

”حسین حبیب آفندی جو کسی زمانے میں بمبئی میں ٹرکس کا نسل تھے،

وہ اب قسطنطنیہ میں پولیس کمشنر ہیں، وہ مجھ کو اس ذریعہ سے جانتے تھے کہ محاربہ

روس میں میں نے بہ حیثیت سیکرٹری انجمن تین ہزار کی رقم ان کے ذریعہ قسطنطنیہ

روانہ کی تھی۔“ (۱۸)

اسی سفرنامے میں شبلی نے عثمان پاشا سے اپنی ملاقات کا ذکر نہایت عقیدت اور احترام

کے ساتھ کیا ہے۔

علی گڑھ آمد سے قبل شبلی کی دیگر مصروفیات میں سے ایک، غیر مقلد حضرات سے مناظرہ

آرائی تھی۔ شبلی کے فارغ التحصیل ہونے اور علی گڑھ ملازمت اختیار کرنے کے درمیان چار پانچ

برس کا وقفہ نظر آتا ہے۔ اس وقفے میں شبلی کے والد کی خواہش تھی کہ وہ یا تو وکیل بنیں یا پھر اور کوئی

شغل شروع کریں اور ان کے کاروبار میں ان کا ہاتھ بٹائیں۔ ان کے نزدیک پڑھنا پڑھانا ہی

زندگی کا مطمح نظر نہیں ہونا چاہیے۔ فراغت کے اسی زمانے میں ان کی مناظرانہ طبیعت نے اظہار

کے پیرائے تلاش کرنے شروع کیے۔ اس کے نتیجے میں ان کی پہلی تصنیف ’اسکات المعتمدی علی

انصاف المعتمدی‘ کے نام سے سامنے آئی جو دوران نماز امام کے پیچھے مقتدیوں کی قرأت سورہ

فاتحہ سے متعلق تھی۔ محمد سمیع کے نام ان کے ایک خط سے معلوم ہوتا ہے کہ شبلی کے چچا نے اس

رسالے کی اشاعت کے لیے سرمایہ فراہم کیا تھا:

”از عم مکرم شیخ عجیب اللہ عجب دارم، ایشان صرف طبع اسکات المعتمدی

بذمہ خود گرفته بودند۔“ (۱۹)

یہ رسالہ ۱۲۹۸ھ بمطابق ۱۸۸۱ء میں مطبع نظامی کان پور سے شائع ہوا تھا۔

شبلی کے والد انھیں وکالت کا امتحان دلوانا چاہتے تھے اور شبلی اس پر راضی نہ تھے۔ مگر

والد کے اصرار پر انھوں نے وکالت کا امتحان دینے کی ہامی بھر لی۔ انھی دنوں اپنے دوست حکیم محمد عمر کو لکھا:

”تسلیم مگر از من و امن التفات بر چیدہ اند کہ از پاسخ نامہ روے در ہم
کشیدہ اند، قسم برستی کہ نامہا فرستادہ ام، اگر نہ رسیدہ باشند مرا در میان خطائے
نیست از تطاول دہر بہ حفظ قانون مشغول ہستم“۔ (۲۰)

آخری فقرے سے اندازہ ہوتا ہے کہ شبلی کے لیے یہ کام کیا حیثیت رکھتا تھا۔ خصوصاً
’از تطاول دہر‘ کی ترکیب سب احوال واضح کرتی ہے۔

وکالت کے امتحان کی تیاری شروع کی گئی اور ساتھ ہی ان کے بھائی مہدی حسن نے
بھی یہ امتحان دینے کا ارادہ کیا۔ دونوں بھائیوں نے پرچے دیے۔ مگر شبلی کے دل میں یہ احساس
تھا کہ پرچے صحیح نہیں دیے گئے۔ کسی ممکنہ حل کی تلاش میں وہ الہ آباد جا کر کالون صاحب کو ملے۔
کالون صاحب وکالت کے امتحان کے ممتحن تھے اور شبلی کے والد کے دوست بھی تھے۔ لیکن معلوم
ہوا کہ اس برس کالون صاحب ممتحن نہیں ہیں۔ افسردہ خاطری کے ساتھ مستقبل کے احوال کا
اندازہ کرنے کے لیے شبلی نے ”دیوان غیب“ (دیوان حافظ) سے فال نکالی۔ ان سب واقعات
کا تذکرہ شبلی کے اس خط میں موجود ہے جو ان دنوں انھوں نے اپنے بھائی مہدی حسن کو لکھا تھا:

”باز گلبانگ پریشان می زخم آتش در عندلیبان می زخم
جلہ گل بہر من کردند و من سر بدیوار گلستان می زخم
المہدی باللہ

حیاک اللہ دی با کالون صاحب برخوردارم، از نام و نسب پرسید، ہمہ باز گفتم، بہ تعظیم تمام
پیش آمد و معذرت خواست کہ امسال صحف اردو نگر لیستن نخواہم۔ دل زدہ بہ خانہ رسیدم، و
از دیوان غیب تفاؤل خواستم، این شعر برآمد،

آنچہ سعیت من اندر طلبت بنمودم این قدر ہست کہ تغیر قضا نتوان کرد
ناامیدی را خیر مقدم گفتم و در پس زانوے حرمان نشستم، ہمانا در دل خواہی گفت کہ با این
ہمہ آزادی بہ بیتے دل بستن، و کاسہ آرزو بر سر یاس شکستن یعنی چہ توان کرد کہ سر بسنگ آمد۔ (۱۲)

اس امتحان میں مہدی حسن کامیاب رہے اور شبلی ناکام ہو گئے۔

اگلے برس پھر وکالت کا امتحان دیا اور کامیاب رہے۔ والد کے کہنے پر اعظم گڑھ میں ہی وکالت شروع کی مگر ”اس عزم اور ارادے کے ساتھ کہ ایک حرف بھی حق و صداقت کے سوا زبان یا قلم سے نہ نکلے گا۔“ (۲۲)

کچھ عرصے بعد وکالت کو اپنے لیے ناموزوں پایا تو ان کے والد نے ان کی ملازمت کی فکر کی۔ اعظم گڑھ میں کلکٹر کی عدالت میں قائم مقام نقل نویس کی ملازمت ملی۔ تنخواہ دس روپے ماہانہ تھی۔ پھر قرق امین کی آسامی خالی ہوئی تو اس پر کچھ عرصہ قائم مقامی کی۔ اس ملازمت کی نوعیت یہ تھی کہ علاقے بھر میں گھوم پھر کر فرائض سرانجام دینے ہوتے تھے۔ اس ملازمت کے دوران شبلی روزے کے ساتھ، گرمیوں کے دنوں میں، گھوڑے پر سوار، سختیاں جھیلتے علاقے بھر کا دورہ کرتے۔ مستزاد یہ کہ افطار و سحر کا کوئی باقاعدہ اہتمام نہیں ہوتا تھا۔ پھر بھی اس نوکری کو وکالت پر ترجیح دیتے تھے۔ انھی دنوں مولوی محمد سمیع کو لکھا ہے:

”حیاک اللہ، زندہ باشی و جان من باشی۔“

غریب تر حالیست منکہ از آشفته سری و شوریدہ مزاجی تن بآ میزش کس
نمی دادم اکنون از فرخی طالع و ہمایونی بخت کارم بخار و خس افتادہ است، مگر من و
خدائے من کہ این ہمہ محنت پڑوہی و نفس گدازی از آن دوست تر دارم کہ ترہاتی
چند در ہم بافند و دروغ راست مانا را پیش کسان جلوہ ظہور و فروغ قبول دہند، نفسے
چند کہ از پیش گاہ ایزدانا دو بیعت آورده ایم، سزائے آنست کہ سررشتہ اش باین
چنین کار بایند باشد، دیگران ندانم تا در سرچہ دارند من خود درین خیال از کشکش و
آویزش فکر فارغ نشستہ ام کہ باین ہمہ خوار بیہمان شبلی ام کہ بودہ ام و اگر گاہے
نختم یاوری کرد، ہمان خواہم بود کہ ہم ہی دود کار امانت روز از شب نشنا ختم دور راہ
طلب از غایت جد و جہد تاب و توان در باختم۔“

یہ نوکری بھی ختم ہو گئی اور اسی خط میں اس کی روداد اور وجہ بھی درج ہے:

”وہر چند کہ درین راہ پُر خطر... تا ختم و در آنجا این کار ہر کس و ناکس

ساختم، مگر با این ہمہ بجائے نرسیدم و خواست و ناخواست پائے ارادت در دامن
قناعت کشیدم، فرمان تقرر ہم بن ندادند تا بہ سند کار گذاری چہ رسید استغفر اللہ سخن
از کجا تا کجا کشید، خیرہ سری از جادہ شکیبائییم بر کران بُرد، سخن کوتاہ مے کنم، (شبلی
نعمانی، اعظم گڑھ، ۲۵/ اگست ۱۸۸۲ء)۔ (۲۳)

شبلی پھر فراغت کی بسر کرنے لگے۔ چونکہ طبیعت کہیں راضی نہ ہوتی تھی لہذا ان کے
والد نے اپنے نیل کے کاروبار سے متعلق چند ایک امور کی دیکھ بھال ان کے سپرد کی کہ بے شغل
رہنے سے یہ بہتر ہے۔ شبلی نے والد کے احترام میں چارنا چار یہ امور نبٹائے، اس کا اندازہ بھی
ایک خط کے ایک فقرے سے ہوتا ہے جو انھوں نے مولوی محمد عمر کو ۱۷ اکتوبر ۱۸۸۲ء کو لکھا:
”... وچوازا این کشکش فارغ نشستم دیگر روئے داد یعنی کارم بہ گودام و
متعلقات اوافتا دو ہر چند آن چنان کارے سزائے این ہچکارہ نہ بود مگر مرا از
انتقال امر حضرت قبلہ گاہی چارہ نبود...“۔ (۲۴)

بالآخر ۱۸۸۳ء کے اوائل میں شبلی کو علی گڑھ میں فارسی و عربی پڑھانے کی ملازمت مل گئی۔
مدرسۃ العلوم علی گڑھ اگرچہ ایک معروف اور اس زمانے کا بلند پایہ ادارہ تھا لیکن شبلی کا دل یہاں
بھی آغاز میں اپنے رتبے اور عہدے سے مطمئن نہ تھا۔ اس امر کا اظہار بھی شبلی نے اپنے چچا کے
نام خط میں کیا ہے مگر یہ بے اطمینانی چند روزہ تھی بعد ازاں شبلی نے اپنی عمر کا ایک قابل قدر حصہ
ادارے میں گزارا۔

ان خطوط میں شبلی کا عمدہ شعری ذوق جا بہ جا نظر آتا ہے۔ دیوان حافظ سے فال نکالنے
کا بھی ذکر ہے۔ بعض خطوط کا آغاز ہی اشعار سے ہوا ہے۔ سرنامے کے یہ اشعار خط میں مندرج
معاملات کے عکاس نظر آتے ہیں۔ مثلاً جس خط میں شبلی نے مہدی حسن کو کالت کے امتحان
کے بعد پیش آنے والے واقعات کا پریشان کن تذکرہ کیا ہے۔ اس خط کے بعض مندرجات اوپر
درج کیے گئے ہیں۔ اس خط کا آغاز ان دو اشعار سے ہوا ہے:

باز گلبانگ پریشان می زخم آتش در عندلیبان می زخم
جلہ گل بہرمن کردند و من سر بہ دیوار گلستان می زخم

علی گڑھ قیام و ملازمت کے ابتدائی مہینوں میں اپنے دوست کو لکھے گئے خط (۱۷/ جنوری ۱۸۸۲ء) کا آغاز اس شعر سے کیا ہے:

دردست دیگرے است سپید و سیاہ ما باروز و شب بہ عربدہ بودن چہ احتیاج
اسی طرح ۲۲ مئی ۱۸۸۳ء کے ایک خط میں مولوی محمد سمیع کو اپنی وطن واپسی کی اطلاع دی ہے اور خط کے آغاز میں یہ شعر لکھا ہے:

شبلی خستہ ز غربت بوطن می آید یا مگر مرغ چمن سوئے چمن می آید
اس کے علاوہ مکاتیب میں کہیں کہیں موضوع مکتوب سے متعلق برجستہ مصرعے اور اشعار بھی درج ہیں۔ ۵ نومبر ۱۸۸۲ء کے خط میں اپنی بے کاری اور من پسند ملازمت میسر نہ آنے پر مولوی محمد عمر کے نام خط میں یہ شعر لکھا ہے:

اکنون این شعر بر زبان حال دارد

از ہجوم چغد در ویرانہ ما جا نماند آن قدر آباد شد آخر کہ مای خواستم
علی گڑھ ملازمت اختیار کرنے سے قبل مختلف اشغال و مصروفیات کے ساتھ ساتھ شبلی اردو و فارسی میں شعر کہتے تھے۔ ان دنوں میں شبلی کی طبیعت کے اس رخ کا اندازہ بھی بعض جگہ ان مکاتیب میں ہوتا ہے۔ حکیم محمد عمر کے نام ایک خط میں شبلی نے اپنی ایک پوری اردو غزل درج کی ہے اور ایک اور غزل کا شعر بھی لکھا ہے۔ اس خط پر تاریخ درج نہیں مگر خط کے مندرجات سے اندازہ ہوتا ہے کہ یہ خط ۱۸۷۷ء کا ہے کیونکہ اس خط میں سلطنت عثمانیہ اور روس کی جنگ کا ذکر ہے۔ اس دوران شبلی نے بھی سلطنت عثمانیہ کی حمایت میں اعظم گڑھ میں چندہ اکٹھا کر کے ترکی بھیجا تھا۔ اس کا تذکرہ سطور بالا میں آچکا ہے۔

غزل اور خط کے کچھ مندرجات یوں ہیں:

چند روزیست کہ در اینجا طرح مشاعرہ نہادہ بودند، غزلے کہ گفتہ آمد این است۔

نا توان عشق نے آخر کیا ایسا ہم کو غم اٹھانے کا بھی باقی نہیں یارا ہم کو
در دفرقت سے ترے ضعف ہے ایسا ہم کو خواب میں بھی ترے دشوار ہے آنا ہم کو
جوش و حشت میں ہو کیا ہم کو بھلا کیا فکر لباس بس کفایت ہے جنون دامن صحرا ہم کو

رہبری کی دہن یار کے جانب خط نے خضر نے چشمہ حیوان یہ دکھایا ہم کو
 دل گرا اس کی زخندان میں فریب خط سے چاہ خس پوش تھا اے ... نہ سوچھا ہم کو
 واہ کا ہیدگی جسم بھی کیا کام آئی بزم میں تھے، پر قبون نے نہ دیکھا ہم کو
 قالب جسم میں جان آگئی گویا شبلی معجزہ فکر نے اپنی یہ دکھایا ہم کو
 غزلے دیگر ہم گفتہ آمد، مگر این نامہ مختصر جائے آن ندارد، یک شعر از دانست این نمط
 گفتہ آمد۔

یوں چشم تر میں قامت جاناں ہے جلوہ گر جس طرح سے کہ سرو لب آب جو رہے
 ”شبلی“، (۲۵)

۲۰ مئی ۱۸۸۳ء کو مولوی محمد سمیع کو لکھتے ہیں:

”۲۴ مئی ۱۸۸۳ء از اینجانب رخت سفر می بندم و اگر خواستہ خدا نیست
 تا ۲۷ بہ عزیزان وطن می پیوندم در لکھنو ...

اور اینجا طرح مشاعرہ انداختہ اند، بہ تقاضائے احباب غزلے گفتہ آمد
 کہ باخوشتن خواہم آورد...“۔ (۲۶)

۱۷ جنوری ۱۸۸۴ء کو مولوی حمید الدین کو اطلاع دی ہے کہ:

”...درین نزدیکی بیٹے چند برروش بحر طویل از زبان خاکہ بردن
 جست آئینہ راز است پارہ از ان می نویسم“۔ (۲۷)

شعر گوئی کے ساتھ ساتھ شبلی کے ذوق تاریخ گوئی کا ایک اشارہ انہی خطوط میں ملفوف
 ہے۔ ۱۰ اکتوبر ۱۸۸۳ء کو اپنے دوست مولوی محمد عمر کے نام خط میں اپنے ایک دوست قاضی محمد سلیم کی
 عیادت پر جانے اور ان کی وفات کا تذکرہ ہے۔ خط کے آخر میں بہ صنعت تعیہ تاریخ کہی گئی ہے:
 چون خواستم ز پیر خرد سال مرگ او از روئے درد گفت کہ قاضی سلیم مرد^(۲۸)

۲ + ۱۲۹۵ = ۱۲۹۹ھ

حواشی

(۱) یادگار شبلی: شیخ محمد اکرام، لاہور، ادارہ ثقافت اسلامیہ، ۱۹۹۴ء، طبع دوم، ص ۳۵۵۔ (۲) ایضاً، ص ۳۵۶۔

(۳) ایضاً، ص ۳۳۵۔ (۴) مولوی حمید الدین فراہی (۱۸۶۳ء۔ ۱۹۳۰ء)۔ شبلی کے ماموں زاد بھائی تھے۔ مولانا عبدالحی فرنگی محلی کے شاگرد، مولانا شبلی سے بھی کسب فیض کیا۔ تکمیل تعلیم کے بعد مدرستہ الاسلام کراچی میں عربی کے استاد ہوئے۔ بعد ازاں علی گڑھ کالج اور حیدر کالج آبد میں بھی امور سرانجام دیے۔ آخری بڑی ذمہ داری اور نیشنل کالج دارالعلوم حیدر آباد دکن کی پرنسپل شپ تھی۔ شبلی ان کو ایک خط میں لکھتے ہیں: اگر دارالمصنفین قائم ہوا تو تمہارے سوا اس کا انتظام و انصرام کون چلا سکتا ہے۔ (مکاتیب شبلی، جلد دوم)۔ (۵) مولوی محمد سمیع بھی شبلی کے عزیز اور شاگرد تھے۔ سید سلیمان ندوی کے الفاظ میں ”مولانا سے ان کو نہایت محبت تھی بلکہ عشق تھا۔“ (مکاتیب شبلی، حصہ اول؛ مرتبہ: سید سلیمان ندوی، اعظم گڑھ، دارالمصنفین، ۱۹۶۶ء، ص ۵۰)۔ (۶) شبلی کے والد حبیب اللہ اعظم گڑھ کی نامور شخصیت تھے۔ وکیل رہے اور کاروبار بھی کرتے تھے۔ فارسی شاعری کا عمدہ ذوق تھا جس کی ایک مثال شبلی نے ”شعر الجم“ میں بیان کی ہے۔ (بحوالہ حیات شبلی؛ سید سلیمان ندوی، اعظم گڑھ، دارالمصنفین، ۱۹۴۳ء، (قیاساً) ص ۶۲)۔ (۷) شیخ عجیب اللہ، شبلی کے چچا تھے اور فارسی کا اچھا مذاق رکھتے تھے۔ (۸) مہدی حسن، شبلی کے چھوٹے بھائی تھے۔ بی۔ اے اور بیرسٹری کی تعلیم انگلستان سے حاصل کی تھی۔ بعد ازاں چند سال منصف رہے۔ ۲۹ جون ۱۸۹۷ء کو جواں عمری میں انتقال کیا۔ (۹) حکیم محمد عمر، شبلی کے ہم تعلیم و ہم صحبت تھے۔ اعظم گڑھ ہی میں ملازم رہے اور یہیں مطب بھی کرتے تھے۔ دارالعلوم دیوبند کے فارغ التحصیل تھے۔ ان کے نام شبلی کا ایک اردو خط ان توصیفی کلمات کے ساتھ شروع ہوتا ہے: برادر مکرما، فخر ما، مقتدائے ما۔ اسی سے ان کی قربت کا اندازہ ہوتا ہے۔ (۱۰) مولوی محمد عمر، یہ شبلی کے شاگردوں میں تھے۔ سرائے میر، اعظم گڑھ کے رہنے والے تھے۔ (۱۱) یادگار شبلی؛ ص ۳۳۴۔ (۱۲) مکاتیب شبلی، حصہ دوم؛ ص ۲۳۶۔ اس خط کے اختتام پر معلوم نہیں کیوں ۱۲۸۹ھ کا سنہ درج ہے حالانکہ جب شبلی مولانا فیض الحسن سے پڑھنے لاہور آئے تو یہ ۱۲۹۱ھ کا زمانہ تھا۔ (۱۳) حیات شبلی؛ ص ۸۱۔ (۱۴) مکاتیب شبلی، حصہ دوم؛ ص ۲۳۷۔ (۱۵) ایضاً۔ (۱۶) ایضاً، ص ۲۴۱۔ (۱۷) ایضاً، ص ۴۲۔ (۱۸) سفرنامہ۔ (۱۹) مکاتیب شبلی، حصہ دوم؛ ص ۲۵۵۔ (۲۰) ایضاً، ص ۲۴۳۔ (۲۱) ایضاً، ص ۲۳۹۔ (۲۲) حیات شبلی؛ ص ۱۱۴۔ (۲۳) مکاتیب شبلی، حصہ دوم؛ ص ۲۵۱۔ (۲۴) ایضاً، ص ۲۴۷۔ (۲۵) ایضاً، ص ۲۴۲۔ اس خط میں شبلی کی درج کردہ یہ اردو غزل کلیات شبلی (اردو) مرتبہ سید سلیمان ندوی میں شامل نہیں ہے۔ (۲۶) ایضاً، ص ۲۵۷۔ (۲۷) ایضاً، ص ۲۴۵۔ (۲۸) ایضاً، ص ۲۴۷۔

قاضی محب اللہ بہاری (م ۱۱۱۹ھ)

جناب طلحہ نعمت ندوی

اسلامی ہند کے آسمان پر جو ستارے اور سیارے روشن ہوئے ان میں قاضی محب اللہ بہاری کی شخصیت اپنی تابناکی کی وجہ سے ممتاز و نمایاں ہے۔ مگر افسوس کہ اس نابغہ روزگار کی کتاب زندگی کے صرف چند ورق علامہ آزاد بلگرامی کی بدولت ہمارے سفینہ علم میں محفوظ ہیں۔ علامہ آزاد کی دو کتابیں عربی میں سبختہ المرجان اور فارسی میں مآثر الکرام کے دو دو صفحے قاضی صاحب کے سوانح زندگی کے نامکمل ماخذ ہیں۔ ان میں بھی بعض جزوی اختلافات کے سوا دونوں مضامین یکساں ہیں۔ لیکن بعد میں جو کچھ لکھا گیا وہ ان دونوں کتابوں ہی کی مدد سے لکھا گیا۔ ذیل میں تلاش و تحقیق کے بعد قاضی صاحب کے سوانح زندگی مرتب کرنے کی ایک کوشش کی گئی ہے۔

ولادت: قاضی صاحب کے سوانح نگار قاضی صاحب کی تاریخ پیدائش کے ذکر سے خاموش ہیں البتہ ان کی جائے پیدائش علامہ آزاد کی تصریح کے مطابق موضع کڑا ہے۔ جناب قیام الدین نظامی فردوسی نے اپنی تصنیف ”شرفاء کی نگری“ میں قاضی صاحب کی زندگی کے بعض نئے گوشے اجاگر کیے ہیں۔ جس میں انہوں نے ان کی عمر چوالیس سال ذکر کی ہے۔ لیکن انہوں نے اس کا کوئی حوالہ نہیں دیا ہے۔ ممکن ہے کہ قاضی صاحب کے بعض اہل خاندان جو پاکستان میں موجود ہیں ان کے پاس کوئی خاندانی ریکارڈ موجود ہو۔ قاضی صاحب کی وفات ۱۱۱۹ھ میں ہوئی۔ اس سے قیاس کیا جاسکتا ہے کہ قاضی صاحب کا سال پیدائش ۱۰۷۵ھ ہوگا۔

علامہ آزاد قاضی صاحب کی جائے پیدائش کے متعلق لکھتے ہیں:

المعبد العالی للدراسات الشرعیہ، دارالعلوم ندوۃ العلماء، لکھنؤ۔

مسقط راس القاضی موضع کرا قاضی صاحب کا مولد موضع کڑا علاقہ محبت علی پور
من توابع محبت علی پور وہی ہے جو شہر بہار (شریف) کے مضافات ہے۔
معمورة من مضافات بہار۔ (۱)

یہاں بہار سے مراد موجودہ بہار شریف ہے جو کبھی پورے صوبہ کا دار الحکومت اور تاریخی مقام رہا ہے۔ اسی سے چند میل کے فاصلہ پر مشہور تاریخی نالندہ یونیورسٹی کے کھنڈرات سے متصل ایک گاؤں کڑا ہے۔ جسے قاضی صاحب کے مرزبوم ہونے کا شرف حاصل ہے۔ آج سے چار سو سال قبل اس جگہ کی تمدنی حیثیت کیا تھی اس کے متعلق کچھ نہیں کہا جاسکتا، لیکن آج یہ ایک قریہ کی حیثیت رکھتا ہے جہاں مسلمانوں کی معتد بہ آبادی ہے۔ یہ بھی انقلاب روزگار کا کرشمہ ہے کہ قاضی صاحب کا وطن آج باقی ہے لیکن علامہ آزاد نے جس علاقہ (محبت علی پور) کا اسے تابع بتایا ہے ان اطراف میں اس کا کوئی سراغ نہیں ملتا۔

خاندان: آزاد نے لکھا ہے کہ قاضی صاحب کے خاندان کا لقب ملک ہے ممکن ہے کہ یہ اس دیار کے اس معروف خاندان کی طرف اشارہ ہو جس کی نسبت عام طور سے فاتح بہار شریف سید ابراہیم ملک بیا کی طرف کی جاتی ہے۔ کہا جاتا ہے کہ سید ابراہیم نے ایک نو مسلم خاتون سے شادی کی تھی، اس خاتون کو پہلے شوہر سے ایک بیٹا تھا جس کی نشوونما حضرت ملک بیا ہی کی سرپرستی میں ہوئی تھی۔ لوگوں نے اسے ملک کا خطاب دیا پھر اسی لقب سے اس کا خاندان مشہور ہوا لیکن بعض محققین کو اس رائے سے اختلاف ہے۔ چنانچہ سید جواد حسن گیاوی نے اپنی کتاب ”تاریخ حسن“ میں لکھا ہے کہ ملک بیا مجرد تھے، فتح کے بعد انہیں دو باندیاں ہاتھ آئی تھیں جن میں ایک حاملہ تھی اسی کے لڑکے کو ملک کا نام دیا گیا۔ (۲)

قاضی صاحب نے خود اپنے ایک رسالہ میں اپنے نام کے ساتھ صدیقی اور عثمانی لکھا ہے۔ یہ رسالہ ندوۃ العلماء کے کتب خانہ میں موجود ہے۔ جو مولف نزہۃ الخواطر کی نظر سے گذر چکا ہے اور شاید انہیں کا عطا کردہ ہے۔ اسی لیے انہوں نے قاضی کے تذکرہ میں ”العثمانی الصدیقی“ کا اضافہ کیا ہے (۳) اور اس کتاب کا خلاصہ بھی پیش کیا ہے۔ اس کے برعکس جناب قیام الدین فردوسی صاحب نے قاضی صاحب کی نسبت سادات سے ثابت کی ہے۔

وہ ان مختلف اقوال کو پیش کرنے کے بعد لکھتے ہیں ”حضرت مولانا قاضی محبت اللہ نسبى طور پر نہ تو عثمانی تھے نہ صدیقی اور ملک برادری سے تو ان کا کوئی تعلق ہی نہ تھا۔ وہ صحیح النسب سادات کے گھرانے سے تعلق رکھتے تھے۔ ہاں یہ ممکن ہے کہ وہ والدہ، دادی یا نانی کی طرف سے عثمانی یا صدیقی ہوں۔“ انہوں نے تذکرہ مسلم شعرائے بہار تصنیف جناب مولانا احمد اللہ ندوی کے حوالہ سے پٹنہ کے بعض سادات خاندانوں کا جدا جدا قاضی صاحب کو بتایا ہے۔ (۴)

اساتذہ اور تعلیم: آزاد کی تصریح کے مطابق قاضی صاحب کی ابتدائی تعلیم وطن ہی میں ہوئی۔ پھر مختلف مقامات کا سفر کیا اور اخیر میں ملاقطب الدین شمس آبادی کی خدمت میں حاضر ہو کر تکمیل کی۔ آزاد بلگرامی لکھتے ہیں:

اخذ اوائل الكتب الدراسية من
مواضع شتى ثم انقطع برمتها الى
حوزة المولوى قطب الدين الشمس
آبادى و بدلالة هذا القطب قطع
مسافة الاغتراب وانتهى الى اقصى
حدود الاكتساب۔ (۵)

ابتدائی کتابیں مختلف جگہوں پر پڑھیں، پھر مولوی
قطب الدین شمس آبادی سے پوری طرح وابستہ
ہو گئے اور اسی قطب وقت کی رہنمائی میں علم و فن
کے منازل طے کرتے ہوئے بلندی و رفعت کی
چوٹی پر پہنچے۔

قاضی صاحب ملاقطب الدین شمس آبادی کے شاگرد کی حیثیت سے مشہور ہیں۔ لیکن ملا عبدالحلیم نے شرح مسلم ملا حسن کے حاشیہ میں اور شاید انہیں کی تقلید میں صاحب نزہۃ الخواطر نے بھی قاضی صاحب کے ملاقطب الدین سہالوی سے بھی تلمذ کا ذکر کیا ہے لیکن ملا ولی اللہ فرنگی محلی نے قاضی صاحب کے بارے میں اپنے ایک قلمی بیاض میں لکھا ہے ”یقال هو تلمیذ جدی بل هو تلمیذ جد جدی“۔ جس سے واضح ہو جاتا ہے کہ وہ ملاقطب الدین سہالوی کے شاگرد نہیں بلکہ بالواسطہ شاگرد ہیں۔

تکمیل علم کے بعد قاضی صاحب نے حیدر آباد کا رخ کیا اور رنگ زیب کے دربار میں پہنچے۔ دربار شاہی سے آپ کو لکھنؤ کے قضاء کا منصب عطا ہوا۔ جناب اسحاق بھٹی صاحب لکھتے ہیں:

”تخصیل علم کے بعد حکومت کے ایوانوں سے وابستہ ہونے کا عزم کیا

اور شاہ ہند اورنگ زیب عالم گیر کے دربار میں پہنچے جو اس زمانہ میں دکن میں مقیم تھا۔ علماء کے اس قدرداں بادشاہ نے ان کی قابلیت سے متاثر ہو کر لکھنؤ کے منصب قضاء پر متمکن کیا۔“ (۶)

قاضی صاحب جس زمانہ میں لکھنؤ کے منصب قضاء پر فائز تھے، اسی دور میں ان کے استاذ بھائی حافظ امان اللہ بنارس لکھنؤ کے امور مذہبی کے صدر الصدور تھے۔ چنانچہ معاشرت کی بنا پر دونوں میں کبھی کبھی دوستانہ مناظرے بھی ہوتے۔ علامہ سید سلیمان ندوی تحریر فرماتے ہیں:

”مسلم و مسلم کے مصنف ملا محبت اللہ بہاری اور حافظ صاحب دونوں ہم عصر تھے اور اتفاق سے لکھنؤ میں جمع ہو گئے تھے۔ ملا صاحب سلطان عالم گیر کے زمانہ میں وہاں کے قاضی اور حافظ صاحب صدر امور مذہبی تھے۔ ان دونوں میں باہم علمی صحبتیں اور دوستانہ مناظرے ہوتے رہتے۔“ (۷)

سید صاحب نے مناظرہ کی جو نوعیت ذکر کی ہے وہ قرین قیاس معلوم ہوتی ہے۔ چنانچہ علامہ آزاد بلگرامی کی عبارت سے بھی یہی اندازہ ہوتا ہے، آزاد بلگرامی لکھتے ہیں:

وكانا يجتمعان وتجري بينهما
مباحث علمية۔ (۸)

مولانا عبدالحی صاحب کی عبارت اور واضح ہے:

فجرت بينهما من المباحثات و
المطارات ما نعم بطون
ان کے درمیان جو بحثیں اور مناظرے ہوئے وہ
کئی صفحات میں آسکتے ہیں۔

الصفحات۔ (۹)

لیکن مولانا قاضی اطہر مبارک پوری نے اس مناظرے کی جو تصویر پیش کی ہے وہ اس طرح ہے کہ لکھنؤ میں تقرری کے بعد دونوں میں بحث و مباحثہ اور علمی مناقشہ کا دروازہ کھل گیا اور لکھنؤ علمی مباحثہ کا اکھاڑہ بن گیا۔ آگے لکھتے ہیں ”دونوں سے رسالہ بازی ہوئی“۔ (۱۰) اور یہ بھی کہ ”لکھنؤ کی صدارت اور قضاء سے دونوں حضرات جلد ہی الگ ہو گئے، مگر مباحثہ کی سرگرمی اس کے بعد بھی جاری رہی اور تصانیف میں رد و قدح کا سلسلہ چلتا رہا۔ قاضی محبت اللہ نے اپنی

بعض کتابوں میں ”قال الفاضل البنارسى“ سے حافظ صاحب ہی کو مراد لیا ہے (۱۱)۔ چنانچہ اس کے بعد قاضی صاحب حیدر آباد کے منصب قضاء پر فائز ہوئے۔

اسی دوران قاضی صاحب بادشاہ کے عتاب کا شکار ہوئے اور منصب قضاء سے معزول کر دیے گئے (۱۲)۔ قاضی صاحب کے سوانح نگاروں نے اس کا کوئی سبب ذکر نہیں کیا ہے لیکن اس کا تجزیہ مولانا سید مناظر احسن گیلانی نے اپنی کتاب ”ہندوستان میں مسلمانوں کا نظام تعلیم و تربیت“ میں کیا ہے۔ مولانا قاضی صاحب کی اولوالعزمیوں اور مقبولیت عام کا تذکرہ کرنے کے بعد لکھتے ہیں ”لیکن بظاہر اسی چیز نے ملا محبت اللہ مرحوم کو محسود اقران بنادیا تھا۔ یوں تو اپنے زمانہ میں دنیاوی حیثیت سے ترقی کے اس آخری نقطہ پر پہنچ کر رہے جو ملا گیری کرنے والوں کی معراج تھا۔ یعنی شاہ عالم بن اورنگ زیب نے برسر حکومت ہونے کے بعد ان کو بقول مولانا آزاد ”صدارت مجموعہ ممالک ہندوستان“ کے عہدہ پر فائز کیا جو ہندوستان میں شیخ الاسلامی کے عہد کے مرادف تھا..... بہر حال جہاں تک میرا خیال ہے اسی چیز نے ملا کو محسود اقران بنادیا تھا“ (۱۳) یوں تو مولانا گیلانی نے اس ضمن میں قاضی صاحب کی طرف جعلی عبارتیں اور خود ساختہ کتاب منسوب کر کے بدنام کرنے کا ذکر کیا ہے۔ لیکن یہ بات بھی عین ممکن ہے کہ بادشاہ کے دربار میں بھی ان کی شکایت پہنچا کر انہیں بدنام کرنے کی کوشش کی گئی ہو۔

بہر حال سفارشوں کے بعد جب بادشاہ کا غصہ فرو ہوا اور اورنگ زیب کو اپنے پوتے رفیع القدر کی تعلیم و تربیت کے لیے کسی اتالیق کی ضرورت پیش آئی تو نظر انتخاب قاضی صاحب ہی پر پڑی اور قاضی صاحب کو معلّیٰ کا عہدہ تفویض کیا گیا اور اس طرح قاضی صاحب کو تدریسی میدان میں بھی اپنے جوہر دکھانے کا موقع ملا۔ پھر جب شاہزادہ شاہ عالم کو کابل کی حکومت سپرد ہوئی تو شاہ عالم نے اپنے اہل و عیال کے ساتھ اپنے فرزند کے اتالیق کو بھی رفیق سفر بنالیا۔ اس طرح قاضی صاحب کی زندگی کے آخری ایام کابل میں گذرے۔ عالم گیری کی وفات کے بعد جب شاہ عالم نے کابل سے دہلی کا رخ کیا تو قاضی صاحب بھی اس کے ساتھ واپس تشریف لائے (۱۴) اس وقت قاضی صاحب کا ستارہ اقبال اپنے عروج پر پہنچا اور صدارت ممالک متحدہ ہندوستان کے عہدہ سے سرفراز ہوئے۔ علامہ آزاد لکھتے ہیں:

اختر قاضی عروج عظیم کرد، وبہ مرحمت منصبی قاضی صاحب کا ستارہ اقبال بلندی پر پہنچا۔
 بلند و صدارت مجموعہ ممالک ہندوستان و صدارت متحدہ ہندوستان کے عظیم منصب پر فائز
 خطاب ”فاضل خاں“ سرمایہ مہابت بدست ہوئے۔ فاضل خاں کا خطاب ملا اور سرمایہ مہابت
 آورد۔ اما عمر وفانہ کرد، شاہ عالم بہ اکبر آباد حاصل ہوا لیکن عمر نے وفانہ کی، شاہ عالم اکبر آباد
 رسیدہ بود کہ قاضی از منصب حیات معزول پہنچا تھا کہ قاضی صاحب نے وفات پائی۔
 گشت۔ (۱۵)

سال وفات اور اکبر آباد پہنچنے کا واقعہ مآثر الکرام میں سبجۃ المرجان پر اضافہ ہے۔ علامہ
 آزاد نے شاہ عالم کے اکبر آباد پہنچنے پر قاضی صاحب کی وفات کا ذکر کیا ہے۔ اگر قاضی صاحب
 شاہ عالم کے رفیق سفر تھے تو پھر قاضی صاحب کی قبر بھی اکبر آباد ہی میں ہونی چاہیے۔ وسائل حمل
 و نقل کی قلت کے باوجود بہار لے جا کر دفن کرنا بعید از قیاس نظر آتا ہے، جیسا کہ رحمٰن علی نے
 ”تذکرہ علمائے ہند“ (۱۶) اور علاقائی مآخذ میں سید کریم الدین علوی نے اپنی تصنیف ”مخزن
 الانساب“ میں (جو شہر بہار شریف کے شرفاء کے تذکرہ پر مشتمل ہے) قاضی صاحب کا مدفن اسی
 شہر کے ایک محلہ چاند پورہ (نزد ریلوے اسٹیشن) میں شیخ فرید الدین طویلہ بخش کے احاطہ میں بتایا
 ہے۔ مصنف کے الفاظ ہیں:

نزد یک روضہ حضرت مخدوم (فرید الدین) حضرت مخدوم ہی کے قریب ملا محبت اللہ بہاری
 علیہ الرحمہ ملا محبت اللہ بہاری صاحب سلم جو کہ حضرت کے خانوادے کے مرید ہیں آسودہ
 کہ از مریدان فرزندان حضرت مخدوم علیہ خواب ہیں۔
 الرحمہ آسودہ است۔ (۱۷)

علامہ آزاد جو قاضی صاحب کے سب سے قدیم سوانح نگار ہیں ان کے مدفن کے سلسلہ
 میں خاموش ہیں۔ اس عبارت سے قاضی صاحب کے تصوف و سلوک سے وابستگی اور بیعت کا
 بھی علم ہوتا ہے۔ قاضی صاحب نے اپنے وطن ہی میں بیعت کی تھی۔ لیکن یہ معلوم نہیں کہ قاضی
 صاحب نے سفر کابل سے پہلے بیعت کی تھی یا واپسی کے بعد۔ اغلب یہ ہے کہ واپسی کے بعد ہی
 بیعت کی ہوگی اور پھر جلد ہی ان کی وفات ہوگئی اور اپنے شیخ کے پہلو میں مدفون ہوئے۔ لہذا اس

سے یہ قیاس کرنا شاید درست ہو کہ قاضی صاحب اس سے قبل وطن تشریف لے آئے تھے اور یہیں انتقال فرمایا۔ ان کا قطعہ تاریخ وفات ”رفقہ سوئے ارم محب اللہ“ اور ”قاضی مولوی محب اللہ“ سے نکالا گیا ہے۔ (۱۸)

معاصرین: قاضی صاحب کے معاصرین میں ملا نظام الدین بانی درس نظامی اور حافظ امان اللہ بنارسی خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ حافظ صاحب سے قاضی صاحب کی معاصرانہ چشمکوں کا تذکرہ گذر چکا ہے۔ ملا نظام الدین لکھنوی سے مراسم کا اندازہ اس سے ہوتا ہے کہ ملا صاحب نے قاضی کی حیات ہی میں ان کی تصنیف مسلم الثبوت کی شرح فرمائی تھی اور ایک روایت کے مطابق انہیں ارسال بھی فرمادی تھی۔ اس کی تفصیلات شروحات سلم العلوم کے تذکرہ میں آئیں گی۔

قاضی صاحب کی تصانیف: قاضی صاحب کو ان کی جن کتابوں نے شہرت جاوید بخشی ہے وہ سلم العلوم اور مسلم الثبوت ہیں۔ جو ایک مدت تک بقول علامہ شبلی علماء کا سرمایہ کمال اور ان کے دستار فضیلت کا طرہ امتیاز رہی ہیں۔ اور بقول علامہ سید سلیمان ندوی ایک صدی تک علمائے فرنگی محل کی ذہنی جولان گاہ رہی ہیں۔ علامہ آزاد نے ان فلسفیانہ بحثوں اور قاضی صاحب کی تحقیقات پر تفصیل سے گفتگو کی ہے۔ جن کا ذکر قارئین کے لیے نہ باعث دلچسپی ہو سکتا ہے نہ مفید، اس لیے انہیں ذکر کرنے کی ضرورت نہیں۔ البتہ ان کی دونوں تصانیف کے حوالہ سے اصول فقہ و منطق میں قاضی صاحب کے کارناموں پر اہل علم و ارباب فضل کے تبصرے اور اقوال کا تذکرہ مناسب معلوم ہوتا ہے۔ علامہ شبلی لکھتے ہیں:

”منطق جو پہلے بالکل سادہ تھی، یعنی اس میں کسی اور فن کی آمیزش نہ

تھی، ملا محب اللہ نے اس میں فلسفہ کے مسائل ملا دیے۔ یہ کتاب ملا نظام الدین نے درس میں داخل کی۔ پھر ملا صاحب کے شاگردوں نے اس پر شرحیں لکھیں۔“

اصول فقہ کے متعلق آگے لکھتے ہیں:

”اصول فقہ کا فن فلسفہ سے بالکل الگ تھا، ملا محب اللہ نے اس میں

بھی فلسفہ کا رنگ پیدا کیا۔“ (۱۹)

سلم العلوم اور اس کی شروحات: سلم العلوم قاضی صاحب کی وہ معرکہ آرا تصنیف ہے جس پر ایک مدت تک علماء کی ذہنی و دماغی صلاحیتیں صرف ہوتی رہی ہیں۔ علمائے متاخرین کی معقولات کی کتابوں میں کم ایسی کتاب ہوگی جو اس قدر علماء کی توجہ کا مرکز رہی ہو اور صدیوں سے اس کی تشریح و تفصیل اور حاشیہ آرائی کی پیہم کوششیں ہوئی ہوں۔ واقعہ یہ ہے کہ یہ ایسا متن متین ہے جس نے علمی دنیا میں ہلچل مچا کر رکھ دی تھی۔ سلم کی شرح و تحشیہ سے نصف صدی قبل تک کا کوئی زمانہ خالی نہیں رہا ہے۔ ہر دور میں علماء نے اس کتاب کی خدمت کر کے اپنے فضل و کمال میں اضافہ کیا ہے۔ دراصل اس کی مقبولیت میں قاضی صاحب کی دعا کا راز مضمر ہے۔ قاضی صاحب نے اس کتاب کے مقدمہ میں یہ دعا کی ہے کہ اے اللہ تو اس کتاب کو شمس النجوم بنادے۔ برصغیر کے نامور محقق جناب اسحاق بھٹی صاحب نے ”تذکرہ فقہائے ہند“ میں اس کتاب کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے ”یہ کتاب اگرچہ مختصر ہے مگر مشمولات منطق کے اعتبار سے اپنے اندر بڑی جامعیت رکھتی ہے۔ مصنف شہیر نے کسی پہلو کو تشنہ نہیں رہنے دیا ہے۔ تمام منطقی اشکالات اور اس فن دقیق کے نزاعی مباحث کا احاطہ کر لیا ہے۔ مصنف نے اس کے مقدمہ میں اس تمنا کا اظہار کیا تھا کہ میں چاہتا ہوں کہ سلم العلوم کتب درسیہ میں اس طرح چمکے جس طرح ستاروں میں چاند چمکتا ہے۔ ان کی زندگی میں ان کی یہ تمنا پوری ہوگئی تھی اور اہل علم نے اس کی شرح لکھنے کی طرف عنان توجہ مبذول کر لی تھی“۔ (۲۰)

کتاب کی خصوصیات و امتیازات پر روشنی ڈالتے ہوئے جناب مولانا عماد الدین قاسمی لکھتے ہیں ”اس کتاب کے پڑھنے سے قاضی صاحب کے بے پناہ ذہن رسا اور قوت مخیلہ کا اندازہ ہوتا ہے۔ ان کی عبارت مستحکم اور افکار و مسائل مدلل ہیں۔ یہ کتاب زبان و بیان کا معرکہ آرا شاہکار ہے۔ جس زمانہ میں یہ کتاب منظر عام پر آئی اس وقت سے لے کر کسی فلسفی عالم کی لیاقت و صلاحیت جانچنے کا معیار بن گئی۔ یہی وجہ ہے کہ ہر دور کے معقولیوں نے اس کتاب کے شروح و حواشی اور حواشی الحواشی لکھ کر اپنی قابلیت کا لوہا منوانے کی کوشش کی ہے۔ اس کتاب کے ذریعہ عالم اسلام کی منطقی مہارت عروج کمال کو پہنچی۔ غالباً ہندو بیرون ہند میں کوئی اس کی افادیت، معنویت اور معقولیت سے آگے نہیں بڑھ سکی“۔ (۲۱) اس کتاب کی سب سے پہلی شرح مصنف

کے معاصر اور بانی درس نظامی ملا نظام الدین کے برادر زادہ ملا احمد عبدالحق کے قلم سے منظر عام پر آئی۔ اس شرح کی تکمیل ۱۱۳۰ھ میں (مصنف کی وفات کے صرف گیارہ سال بعد) ہوئی ہے، جیسا کہ خاتمہ میں مذکور ہے۔ اس طرح شارح مصنف کے تقریباً ہم عصر ہیں۔ شارح نے اس شرح کی خصوصیات مقدمہ میں ذکر کی ہیں۔ ان کے الفاظ ہیں:

و کنت بالغافی الايضاح لم نجد
مثله شرحا موضحا فائقا نافعا
للمطالب -
میں نے اس کے مطالب کی توضیح کی پوری کوشش
کی ہے۔ اتنی وضاحت کے ساتھ کوئی دوسری
شرح مجھے نظر نہیں آئی جو طلبہ کے لیے مفید ہو۔

درسی ضروریات کے پیش نظر قاضی صاحب کی دونوں تصانیف کی تشریح و تفسیر خانوادہ فرنگی محل کا امتیاز رہا ہے اور وہاں کے ائمہ فن و ارباب علم نے ہر دور میں ان دونوں کتابوں کی خدمت کو اپنا سرمایہ کمال سمجھا ہے۔ چنانچہ جیسا کہ اوپر گذر چکا مسلم الثبوت کی سب سے پہلی شرح خود بانی درس نظامی کے قلم سے معرض وجود میں آئی۔ سلم العلوم کی تشریح میں اس خانوادہ کی خدمات حسب ذیل ہیں:

۱- شرح سلم العلوم از ملا احمد عبدالحق - ۲- شرح از ملا مبین - ۳- شرح از ملا حسن فرنگی محلی - ۴- شرح از ملا بحر العلوم - ۵- حاشیہ از ملا عبدالحلیم فرنگی محلی -

اس خاندان کے علاوہ جن ارباب کمال نے اس کو موضوع بحث بنایا ان میں قاضی مبارک گوپاموی، ملا احمد اللہ سندیلوی، قاضی احمد بن فتح محمد سندیلوی، مفتی شرف الدین رامپوری، شیخ وارث رسول نمابارسی اور مولانا ابراہیم بلیاوی قابل ذکر ہیں۔ ان کے علاوہ مصر کے فاضل علامہ محمد بن علی الصبان نے بھی اس کتاب کی شرح لکھی ہے۔ قاضی صاحب نے سلم العلوم، مسلم الثبوت سے پہلے تصنیف کی اور اس کے ساتھ اس کی منہیات بھی لکھی، جیسا کہ سلم العلوم کی بعض عبارت سے معلوم ہوتا ہے۔ مسلم الثبوت میں بعض جگہ لکھتے ہیں ”وفیه نظر اثرت الیہ فی السلم“، کہیں لکھتے ”وقد فرغنا عنها فی السلم والافادات“، مسلم الثبوت تاریخی نام ہے، جس سے سال تصنیف ۱۱۰۹ھ نکلتا ہے۔

مسلم الثبوت اور اس کی شروحات: قاضی صاحب کی دوسری معرکہ آرا تصنیف

اصول فقہ میں مسلم الثبوت ہے۔ ”حالات مصنفین“ کے مرتب مولانا حنیف گنگوہی اس کتاب کے متعلق لکھتے ہیں ”مسلم الثبوت قاضی محبت اللہ بہاری کی نہایت عالی کتاب ہے جو غالباً علامہ ابن ہمام کی تحریر، ابن حاجب کی مختصر اور قاضی بیضاوی کی منہاج سے ماخوذ ہے۔ بہت سی جگہ فاضل موصوف نے اپنی تحقیقات کا بھی اضافہ کیا ہے۔ ہر فریق کے دلائل پھر شبہات و جوابات کی بھرمار، مواضع صعبہ و مباحث مشککہ کا بہترین حل اس کے ساتھ ساتھ عمدگی عبارت و غایت اختصار وغیرہ امور اس کتاب کا طرہ امتیاز ہے۔“ (۲۲)

مسلم الثبوت میں حنفی و شافعی دونوں مسالک کے اصول پر بحث کی گئی ہے۔ ملا حبیب اللہ قندھاری نے اس کتاب کو دیکھ کر اسی انداز پر ایک کتاب ”مغتتم الحصول فی علم الاصول“ لکھی جس میں مسلم الثبوت کے بعض مقامات کا بڑا فاضلانہ اور محققانہ محاکمہ کیا ہے۔ (۲۳)

مسلم الثبوت کے سب سے پہلے شارح مصنف کے رفیق و معاصر اور بانی درس نظامی ملا نظام الدین فرنگی محلی ہیں۔ جنہوں نے ”الفوائد العظمیٰ“ کے نام سے قاضی صاحب کی حیات ہی میں اس کی شرح تحریر فرمائی تھی۔ مصنف ”بانی درس نظامی“ مفتی رضا انصاری فرنگی محلی لکھتے ہیں ”اولین شارح (مسلم الثبوت کے) ملا نظام الدین تھے جنہوں نے ملا بہاری کی زندگی ہی میں شرح لکھی تھی اور ایک روایت کے مطابق ملا بہاری کو ارسال بھی کر دی تھی۔ ملا صاحب کے پوتے ملا عبدالاعلیٰ کے مطابق ملا صاحب نے مسلم الثبوت کی دو شرحیں لکھی تھیں۔ ایک اطول، دوسری طویل لیکن شرح اطول مفقود ہو گئی ہے۔ دوسری شرح طویل تھی۔“ (۲۴)

اس کتاب کی آخری شرح ملا عبدالحق بن ملا فضل حق خیر آبادی (م ۱۳۱۸ھ) نے لکھی ہے۔ ملا عبدالحق نے قاضی صاحب کی دونوں کتابوں کی توضیح و تشریح میں حصہ لیا۔ سلم العلوم کی شرح قاضی حمد اللہ اور شرح قاضی مبارک دونوں پر حواشی لکھے اور مسلم الثبوت کا بھی حاشیہ لکھا۔ ان دونوں شرحوں کے علاوہ اس کتاب کی درج ذیل شروحات لکھی گئیں۔ کشف المبہم عما فی المسلم از علامہ محمد بشیر الدین بن محمد کریم الدین عثمانی قنوجی (م ۱۳۹۶ھ)۔ التعلیق المنعوت شرح مسلم الثبوت از مولانا برکت اللہ بن محمد احمد اللہ فرنگی محلی۔ فواتح الرحموت، یہ اس کتاب کی سب سے مشہور شرح ہے اور خانوادہ فرنگی محل کے نامور فرزند ملا عبدالعلی بحر العلوم کے

زور قلم کا شمرہ ہے۔ مفاتیح البیوت فی حل مسلم الثبوت از مولانا فیض الحسن سہارن پوری (م ۱۳۰۴ھ)۔ شرح مسلم الثبوت از ملا حسن (تامبادی الاحکام) شرح ملا محمد مبین فرنگی محلی۔ نفائس الملکوت از مولوی ولی اللہ فرنگی محلی (م ۱۳۷۰ھ)۔

ان دونوں کتابوں کے علاوہ آزاد بلگرامی نے قاضی صاحب کی ایک اور کتاب ”الجوہر الفرد فی مبحث الجزء الذی لا یتجزی“ کا ذکر کیا ہے۔ پھر ان تینوں کتابوں کے ذکر کے بعد لکھتے ہیں ”والتصانیف الثلاثة مقبولة متداولة فی مدارس العلماء“ (۲۵)۔ (تینوں رسالے مدارس میں رائج ہیں) بعد کے سوانح نگاروں نے دیگر کتابوں کا بھی اضافہ کیا ہے۔ جیسے ”رسالة فی المغلطات العامة الورود“ (۲۶) اور ”رسالة فی ان الحنفیة ابعث عن الراى من الشافعية“ (۲۷)۔ کتب خانہ رضارام پور کی فہرست مخطوطات میں رسالة فی العلم الطبیعی اور آزاد لائبریری علی گڑھ کے مولانا عبدالحی لکھنوی کلکشن میں رسالة فی الفطرة الالهیة بھی قاضی صاحب کی طرف منسوب ہے (۲۸)۔ آخر الذکر تینوں رسالوں کی نسبت تحقیق طلب ہے، صرف کیٹلاگ میں ان کا نام کافی نہیں۔ ان کے علاوہ بھی دو کتابوں کا انکشاف قاضی صاحب کے سوانح نگاروں نے خود ان کی تصنیف سے کیا ہے۔ الرسالة فی الفطرة الالهیة جس میں اصول غامضہ مذکور ہیں، نیز مسئلہ اختیار پر بھی بحث کی گئی ہے۔ اس کے بارے میں خود مصنف کے الفاظ ہیں ”وانہا اجدی من تفاریق العصا“ جس سے اس کتاب کی اہمیت کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔ مسلم الثبوت میں ایک رسالہ ”الافادات“ کا بھی اشارہ ملتا ہے۔ اس کتاب میں بعض جگہ لکھتے ہیں ”وقد فرغنا عنها فی السلم والافادات“ کہا جاتا ہے کہ قاضی صاحب نے سلم العلوم کی منہیات بھی لکھی تھیں۔ ممکن ہے ”الافادات“ کے لفظ سے اسی کی طرف اشارہ ہو۔

قاضی صاحب اور تصوف و سلوک: قاضی محبت اللہ بہاری ایک طرف جہاں علوم عقلیہ و نقلیہ کے جامع تھے وہیں سلوک و معرفت کی راہ سے بھی بیگانہ نہ تھے۔ علوم عقلیہ میں عروج و ارتقاء کی آخری منزل پہنچنے کے بعد قاضی صاحب نے اپنے ایک ہم وطن بزرگ کے ہاتھ پر بیعت کی تھی اور اس طرح وہ شریعت و طریقت دونوں کے مجمع البحرین تھے۔ قاضی صاحب کا یہ وہ

امتیاز ہے جو عام طور پر علمائے معقولات اور ارباب فلسفہ و حکمت کی صف میں کم نظر آتا ہے۔ قاضی صاحب کا علمی مقام و مرتبہ اور خصوصیات: قاضی صاحب کی عقلی و نقلی علوم میں دسترس و مہارت اہل علم کے درمیان کسی تذکرہ کی محتاج نہیں۔ قاضی صاحب کی عظمت و رفعت کو ان کے سوانح نگار علامہ آزاد بلگرامی نے دریا بکوزہ کے مصداق اپنے دو بلیغ و جامع لفظوں میں بیان کر کے ان کی علمی عظمت کا مرقع پیش کر دیا ہے۔ ان کے الفاظ ہیں ”القاضی بدر بین النجوم وبحر بین العلوم“۔ آزاد بلگرامی کے ان دو لفظوں سے قاضی صاحب کے مقام و مرتبہ اور عظمت کا بخوبی اندازہ ہو سکتا ہے۔ اسی طرح صاحب نزہۃ الخواطر نے قاضی صاحب کے تذکرہ کا آغاز ”احد الاذکیاء المشہورین فی الآفاق“ کے جامع الفاظ سے کیا ہے اور یہ حقیقت ہے کہ خداداد ذہانت و طباعی کی جو خصوصیات قاضی صاحب کو ودیعت ہوئی تھیں، وہ خال خال ہی کسی کے حصہ میں آتی ہیں۔ ان کی تصانیف کی سطر سطر اس کی شہادت پیش کرتی ہے۔ قاضی صاحب کے ایک تذکرہ نگار لکھتے ہیں:

”قاضی محبت اللہ بہاری کا ذہن رسا اور فکری صلاحیت بہ درجہ اتم حاصل تھی۔

آپ کا ذہن تقلیدی نہیں بلکہ خلاقی تھا۔ آپ جدت پسند تھے، آپ نے سلم العلوم کا

آغاز ہی انوکھے ڈھنگ سے کیا ہے۔“ (۲۹)

جناب اسحاق بھٹی صاحب لکھتے ہیں:

”ہندوستان کی سرزمین کو جن اجلہ علماء کے قدم چومنے کا شرف حاصل ہوا

ان میں قاضی محبت اللہ بہاری کے نام نامی کو بہت اہمیت حاصل ہے۔ ان کو اللہ نے

خوب شہرت عطا کی اور اپنے معاصرین میں نہایت عزت و احترام کی نگاہ سے دیکھے

گئے۔ ان کو یہ سعادت نصیب ہوئی کہ اسی دور میں ان کتابوں کو درس نظامیہ میں

شامل کیا گیا اور ان کے حواشی و شروح معرض تحریر میں لائے گئے۔“ (۳۰)

یہاں ایک سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ قاضی صاحب کا شمار عہد جہاں گیری کے نامور فضلاء میں ہوتا ہے۔ فقہ و اصول فقہ ان کا علمی اثاثہ تھا اور منصب قضاء سے طویل مدت تک وابستگی نے مزید ان کے تجربات میں اضافہ اور علم میں پختگی پیدا کی ہوگی لیکن اس کے باوجود قانون اسلامی

کی ترتیب و تدوین کے لیے علماء کی جو کمیٹی تشکیل دی گئی تھی (جو بعد میں فتاویٰ عالمگیری کی شکل میں سامنے آئی) اس میں قاضی صاحب کا نام نظر نہیں آتا۔ اس کا جواب دیتے ہوئے جناب مولانا عماد الدین قاسمی لکھتے ہیں:

”اس کا جواب اس کے علاوہ کچھ نہیں ہو سکتا کہ چونکہ قاضی صاحب کچھ دنوں کے لیے لکھنؤ اور اس کے بعد حیدرآباد کے قاضی بنائے گئے جو مرکز سے کافی دور تھا۔ اس کے علاوہ بادشاہ کو اپنے پوتے کی تعلیم و تربیت کے لیے ایک قابل اور باصلاحیت عالم کی ضرورت تھی، لہذا وہ اس کے پوتے کی تعلیم و تربیت کے لیے حیدرآباد کے بعد کابل چلے گئے..... اس طرح قاضی صاحب فتاویٰ کی تدوین میں شریک نہیں ہو سکے۔“ (۳۱)

حواشی

- (۱) سبحة المرجان، ص ۱۹۸، مطبوعہ علی گڑھ۔ (۲) شرفاء کی نگری، ج ۲، از قیام الدین نظامی فردوسی، مطبوعہ نظامی اکیڈمی کراچی، ۲۰۰۴ء، ص ۱۷۷۔ (۳) نزہۃ الخواطر (الاعلام بمن فی الہند من الاعلام)، ج ۶، ص ۳۹۔
- (۴) ملاحظہ ہو شرفاء کی نگری، ص ۱۷۷۔ (۵) سبحة المرجان، ص ۱۹۸۔ (۶) فقہائے ہند، ص ۹۹۔ (۷) معارف، اکتوبر ۱۹۳۹ء، بحوالہ آثار الکرام۔ (۸) سبحة المرجان، ص ۱۹۸۔ (۹) نزہۃ الخواطر، ج ۶، ص ۳۹۔ (۱۰) معارف، اگست ۱۹۷۲ء، حافظ امان اللہ بناری۔ (۱۱) حوالہ بالا، ص ۱۱۲۔ (۱۲) سبحة المرجان، ص ۱۹۸۔ (۱۳) ایضاً، ص ۱۹۸۔
- (۱۴) ایضاً، ص ۵۸۔ (۱۵) آثار الکرام، ص ۲۱۱، مطبوعہ آگرہ، ۱۹۱۰ء۔ (۱۶) تذکرہ علمائے ہند، ص ۴۵۔ (۱۷) مخزن الانساب، ص ۲۰، مطبوعہ پٹنہ، ۱۳۳۹ھ۔ (۱۸) تذکرہ علمائے ہند از مولوی رحمان علی، مرتبہ ایوب قادری، مطبوعہ کراچی، ص ۴۵۔ (۱۹) مقالات شبلی، ص ۱۲۴۔ (۲۰) فقہائے ہند، ص ۱۰۱۔ (۲۱) مجلہ صدی تقریبات مدرسہ منیر الاسلام بہار شریف، ۲۰۰۴ء، تذکرہ قاضی محبت اللہ۔ (۲۲) حالات مصنفین، ص ۱۷۶۔ (۲۳) فقہائے ہند، ص ۱۰۳۔ (۲۴) بانی درس نظامی، ص ۲۱۵ و ۱، بحوالہ رسالہ قطبیہ، مطبوعہ ندوۃ العلماء لکھنؤ، ۱۹۷۳ء۔ (۲۵) ص ۱۹۸۔ (۲۶) تذکرہ علمائے ہند، ص ۴۵، نزہۃ الخواطر۔ (۲۷) نزہۃ الخواطر، ج ۶، ص ۳۹۔ (۲۸) تذکرہ کمالان بہار، مطبوعہ خدا بخش لائبریری پٹنہ، مضمون قاضی محبت اللہ از ڈاکٹر حامد علی خاں، علی گڑھ، ص ۸۲۵۔ (۲۹) حوالہ سابق۔ (۳۰) فقہائے ہند، ص ۹۹۔ (۳۱) مجلہ صدی تقریبات مدرسہ منیر الاسلام بہار شریف۔

اخبار علمیہ

”آیہ من آیات اللہ“

مصر کے سید مصطفیٰ کی عمر کل گیارہ برس کی ہے لیکن خداداد صلاحیت، قوت حافظہ اور محنت شاقہ کی بدولت اس نے تین ماہ میں قرآن مجید اور چھ مہینوں میں قرأت عشرہ پر مشتمل مکمل قرآن حفظ کر لیا، یہ کارنامہ بے مثال ہی کہا جائے گا، اتنا ہی نہیں اس نے ۴۰ دنوں میں بخاری، مسلم اور مفردات البخاری کی گیارہ ہزار حدیثیں بھی یاد کر ڈالیں۔ تحفۃ الاطفال، سنن الجزریہ، الشاطبیہ، الدرہ، الفیہ ابن مالک، لدنیہ ابن قیم اور جلالین وغیرہ جیسی مشکل ترین کتابیں بھی اس نے از بر کر لی ہیں، ان دنوں وہ توریت اور انجیل کے مختلف نسخوں کو یاد کرنے اور انٹرنیٹ اور ٹی وی پر قرآن عشرہ کے اصولوں، علم العروض، حنفی و شافعی فقہ اور قرآن مجید کے رسم خط پر درس و تدریس میں مصروف ہے۔ متعدد عرب ملکوں اور جامعہ ازہر وغیرہ کی جانب سے اس لڑکے کو اس کے کمالات پر انعامات، تمغات اور اعزازی اسناد سے نوازا گیا ہے، اس ہونہار کی خواہش ہے کہ وہ ایک صحیح عالم کی شکل میں دین حنیف کی تبلیغی اور دعوتی خدمات انجام دے کر اپنے والد کے خواب کو شرمندہ تعبیر کرے۔ (صراط مستقیم، برمنگھم، جون ۱۳ء)۔

”آئزم“

آئزم ایک قسم کی نفسیاتی خرابی ہے یہ مرض نہیں ہے۔ جرنل جاما سائیکاٹری میں شائع تحقیق کے مطابق یہ ایک موروثی خطرہ ہے جو نسل در نسل منتقل ہوتا رہتا ہے، یہ دراصل جنین میں موجود غیر متوازن خلیے اور جرثومے ہوتے ہیں جو باعث ضرر تو نہیں ہوتے مگر آئندہ نسلوں میں آئزم کے خطرات کے امکانات ضرور بڑھادیتے ہیں۔ اس کیفیت میں مبتلا بچے گو بے حد ذہین ہوتے ہیں مگر جب وہ عنفوان شباب میں قدم رکھتے ہیں تو دنیا انہیں ایک جنجال معلوم ہوتی ہے، انہیں خوشی ناخوشی اور پہلی ہی ملاقات میں گھل مل جانے کا صحیح شعور نہیں ہو پاتا، ایسے بچے اپنے دل پسند موضوعات پر ہی بات کرنا چاہتے ہیں اور اس پر زیادہ سے زیادہ معلومات بھی اکٹھا کر لیتے ہیں، ایسے لوگ قنوطیت کا شکار تو ہوتے ہیں مگر روزمرہ کے عام معمولات سے اکتاتے بھی نہیں۔

برطانوی محکمہ صحت کے مطابق ہر سو میں ایک بالغ آٹزم میں مبتلا ہے جب کہ امریکہ کے سرکاری اعداد و شمار کے مطابق اسکول جانے والے ۵۰ طلبہ میں ایک بچہ آٹزم کا شکار ہے۔ عام طور پر یہ بچے زبان سمجھنے اور استعمال کرنے، تبادلہ خیالات اور سماجی روابط استوار کرنے میں دشواری محسوس کرتے ہیں۔ محققین کے مطابق اس نفسیاتی خرابی سے نجات کی اب تک کوئی تدبیر واضح طور پر سامنے نہیں آئی ہے۔ تاہم ایسے بچوں سے آسان اور سادہ الفاظ اور چھوٹے چھوٹے فقرہوں میں بات کرنا ان کے لیے مددگار ثابت ہو سکتا ہے۔ انہیں جواب دینے کے لیے وقت دینا بھی ضروری ہے۔ اقوام متحدہ نے ۲ اپریل کو ”یوم آٹزم“ کے طور پر مختص کیا ہے۔

”کف پاسکیٹروں قسم کے بیکیٹریوں کا مسکن“

ایک طبی تحقیق میں امریکی سائنس دانوں نے انکشاف کیا ہے کہ ٹخنوں سمیت انسانی پیر تقریباً ۲۰۰ متنوع قسم کے جرثوموں کی آماج گاہ ہے۔ انہوں نے کہا کہ یوں تو پورا جسم غیر مرئی جراثیم سے ہمہ وقت آلودہ ہے، مگر دوسرے اعضاء کی بہ نسبت ٹخنوں، پیر کے ناخنوں اور پیروں کی انگلیوں کے درمیان جراثیم بہت زیادہ پائے جاتے ہیں، جبکہ برو، کان اور سر کے پچھلے حصے، ناک کے دونوں سو ران، سیدہ، ہتھیلی اور شانوں پر بھی یہ خاصی تعداد میں ملتے ہیں مثلاً ٹخنہ پر ۸۰، پیروں کی انگلیوں میں ۱۴۰ اور اس کے ناخنوں میں ۶۰، ہتھیلی، کہنی اور شانوں پر ۱۸ سے ۲۰ قسم کے جرثومے موجود ہیں، کہا گیا کہ جسم پر جتنے جرثوموں کا علم ہوا ہے اس کی تعداد غیر معلوم جرثوموں سے بہت کم ہے۔ محققین کے مطابق یہ جرثومے اصلاً جلدی بیماریوں کی مدافعت کرتے ہیں مگر جب کسی سبب سے ان میں عدم توازن واقع ہو جاتا ہے تو یہی متعدی امراض کا سبب بھی بن جاتے ہیں۔ رسالہ نیچر میں شائع یہ تحقیق عربی کے اجتماع علمی المغربی میں نقل ہوئی ہے، اس نئی تحقیق سے وضو کے دوران انگلیوں میں خلل کی حکمت اور صحت سے متعلق تعلیمات نبویؐ کی اہمیت کھل کر سامنے آتی ہے۔

”ترقی پذیر ممالک میں معذور بچوں کی افسوس ناک صورت حال“

صنعتی اور ترقی یافتہ ممالک میں معذور افراد بالخصوص بچوں کی پیشہ ورانہ تربیت اور ذہنی اور جسمانی نشوونما کے لیے خصوصی تربیتی مراکز قائم ہیں، جن میں بہترین سہولتیں مہیا کرائی جاتی ہیں لیکن

دنیا کے اور خطوں خاص طور پر ترقی پذیر ملکوں میں اس جانب افسوس ناک حد تک بے پروائی برتی جاتی ہے۔ یونیسف نے معذور بچوں کی صورت حال پر اپنی ایک تازہ رپورٹ میں عالمی ادارہ صحت کے حوالہ سے کہا ہے کہ ترقی پذیر خطوں میں محض ۱۵ فیصد معذور افراد کو ضروری اور طبی سہولتیں حاصل ہیں مثلاً مرگی کے مریض عام طور سے مناسب دواؤں سے اور معذور افراد وہیل چیئر سے محروم ہیں۔ معذور بچوں کے حقوق کے تحفظ پر ہونے والے جلسوں میں دستخط کرنے کے باوجود یہ ملک ان مسائل کو نظر انداز کر دیتے ہیں۔ اس طرح یہ معذور بچے صحیح علاج و نگہداشت سے محروم ہی رہ جاتے ہیں۔

”عہد صفوی کے قالین کی نیلامی“

قالین بانی میں ایران کو نمایاں مقام حاصل ہے، قم، مشهد اور اصفہان کے دیہی علاقوں میں تیار ہونے والے قالین دنیا بھر میں انتہائی مقبول ہیں۔ العربیہ نیٹ کی خبر کے مطابق عہد صفوی کے یعنی ۳۵۰ برس قبل کے ایک ایرانی قالین کی لمبائی ۶۷، ۲ اور چوڑائی ۹۵، ۱ ہے اور اس طرح کا اس کل حجم پانچ مربع میٹر ہے اور یہ اس وقت امریکہ آرٹ میوزیم کی ملک ہے۔ انیسویں صدی کے اوائل کے ایک امریکی کانگریس کارکن ولیم کلارک کو فرانس کے دورہ پر یہ قالین ملا تھا۔ مرنے سے کچھ عرصہ قبل ۱۹۲۵ء میں انہوں نے اس مذکورہ میوزیم کو ہدیہ کر دیا، قالین کے ضروری سامان کی عمدگی اور اس سے زیادہ اپنی فنی خوبیوں کی وجہ سے یہ آج بھی بالکل نیا اور دلکش نظر آتا ہے، اس کی بناوٹ میں ایران کے صوفیانہ رموز و اشارات پنہاں ہیں مثلاً اس کے کمان نما خمیدہ ہلال پھول مجلس سماع کے رقص کی جانب اشارہ کرتے ہیں جس میں اہل تصوف ایک خاص زاویہ سے چکر لگاتے ہوئے اپنے جسم کو دیکھتے ہیں جس کا مقصد موت کو یاد کرنا ہے۔ اس میں ۱۲ رنگوں کے دھاگوں کے استعمال کے متعلق ماہرین کا کہنا ہے کہ یہ سال کے ہر رنگ کے موسم کی جانب اشارہ کرتے ہیں۔ منفرد صنعتی کاری گری کے سبب قالین کی اہمیت و شہرت ایسی ہے کہ میوزیم کے ذمہ داروں نے امریکہ میں حالیہ سیلاب سے متاثرین کی امداد کے لیے جب اس کی نیلامی کا فیصلہ کیا تو اس کی قیمت ۱۰ ملین ڈالر تک پہنچ گئی۔ اس سے قبل دنیا کا سب سے گراں ”کرمان“ نامی ایرانی قالین ساڑھے نو ملین ڈالر میں لندن میں فروخت ہوا تھا۔

ک، ص اصلاحی

معارف کی ڈاک

قاطع برہان بہ خط غالب

محلہ پچدرہ،
نزد جنوں والی مسجد،
امروہہ، یوپی

مکرمی! سلام مسنون۔

ہندوستان کے مشہور تاجر کتب اور نوادہ فروش یعنی میرے والد بزرگوار جناب توفیق احمد قادری چشتی مدظلہ العالی نے مرزا اسد اللہ خاں غالب کے ہاتھ کا لکھا ہوا نسخہ قاطع برہان ۲۲/مارچ ۲۰۱۳ء بروز جمعہ حیدرآباد سے خریدا۔ جس پر کوئی ترقیمہ نہیں ہے۔ لیکن والد محترم نے جب کہا کہ مجھے غالب کا خط معلوم ہوتا ہے تب احقر نے غالب کی دوسری تحریروں سے اس نسخے کو ملا کر دیکھا تو غالب کا خط ثابت ہوا۔ غالب کے لکھنے کا اپنا ایک جداگانہ انداز ہے یا یوں کہہ لیجئے کہ غالب کا املا منفرد ہے۔ علامہ پروفیسر ثار احمد فاروقی مرحوم غالب کے املا کے متعلق نقوش کے غالب نمبر حصہ دوم مطبوعہ ۱۹۸۲ء، لاہور کے صفحہ ۱۴ پر رقمطراز ہیں۔

”غالب کے طرز تحریر کی کچھ خصوصیات ہیں، جنہیں ان کی تحریروں کو دیکھنے والے آسانی سے پہچان سکتے ہیں۔ مثلاً وہ الف اور دال یا الف اور راکو ملا دیتے ہیں، یعنی فریادی، بہادر، بہار وغیرہ الفاظ اس طرح لکھیں گے کہ دال یا رے، الف ہی میں جڑی ہوئی ہوگی۔ یاے معروف و مجہول اگر بغیر وصل آئے تو سامنے کی طرف پھیلی ہوئی ہوگی یعنی لفظ شوخی، اس طرح لکھیں گے کہ یا کا آخری حصہ بڑی سی رے معلوم ہوگا۔ اسی طرح غیر مخلوط ہائے ہوز کا سرائے اتنا دبیز کر دیں گے کہ اگر اس کے نیچے شوشانہ ہو تو اسے میم بھی سمجھا جاسکتا ہے۔ دال اور وا کو ملا دینا بھی غالب کی منفرد روش ہے۔ وہ ’دو‘ یا ’دوری‘ یا ’دوست‘ اس طرح لکھتے ہیں کہ اس شکل کو ٹائپ میں ظاہر کرنا بہت مشکل ہے۔ بعض الفاظ کو

ملا کر لکھنا بھی ان کی روش ہے۔ مثلاً ’محفل میں‘ کو یوں لکھیں گے: محفلمیں۔ اسی طرح: مجلسیں، جوشمیں وغیرہ۔“

اگر کسی لفظ میں دال اور واو دونوں حروف ہیں تو ان کا مجموعہ دو چشمی ہا کی طرح بھی بنا دیتے ہیں۔ جیسے افزودن میں آخری تینوں حرف ایک دوسرے سے ملے ہوئے ہوں گے۔
ب ت ٹ وغیرہ حروف وہ دو طرح لکھتے ہیں، کبھی تو دندانِ دانت، جس کا شوشہ آخر میں اوپر کی طرف اٹھتا ہوا ہوتا ہے اور کبھی اس طرح کہ مقام وصل پر وہ دبیز ہوتی ہے اور آگے بڑھتے ہوئے ٹکیلی ہوتی جاتی ہے۔ یہاں تک کہ بالکل خنجر کی سی شکل بن جاتی ہے۔

جب پروفیسر شریف حسین قاسمی صاحب سابق صدر شعبہ فارسی دلی یونیورسٹی دلی (ساکن ۲۳- ڈی، ایسٹ نظام الدین، نئی دہلی) نے ۱۸/اپریل ۲۰۱۳ء بروز جمعرات بعد نماز عصر مذکورہ مخطوطہ دیکھا تب پروفیسر صاحب نے فرمایا کہ شواہد یہ بتلاتے ہیں کہ یہ نسخہ قاطع برہان بخط غالب ہی ہے۔ نیز فرمایا کہ میں اپنے یہ جملے کسی کے بھی سامنے دوہرا سکتا ہوں۔

میں نے ماہر غالبیات لائق صدا احترام ڈاکٹر خلیق انجم صاحب کی خدمت میں مذکورہ نسخہ کے چند زیر اس اور زیر نظر مضمون اسپید پوسٹ سے روانہ کیے تھے۔ بعدہ احقر کی موبائیل پر ۵/جون ۲۰۱۳ء بروز بدھ ڈاکٹر صاحب سے گفتگو ہوئی۔ آپ نے فرمایا کہ میں پروفیسر شریف حسین قاسمی صاحب کے بیان سے پوری طرح اتفاق کرتا ہوں۔ یہ قلمی نسخہ قاطع برہان بخط غالب ہی ہے۔
لہذا بزرگی و لائق صدا احترام جناب ڈاکٹر خلیق انجم مدظلہ العالی نے میرے خط کا جواب ۶/مئی ۲۰۱۳ء کو لکھا جو مجھے ۱۰/جون ۲۰۱۳ء کو بذریعہ ڈاک موصول ہوا۔ آپ نے اس نسخہ کو GEUINE لکھا ہے۔ موصوف کا خط بجنسہ یہاں نقل کیا جاتا ہے۔

۶/مئی ۲۰۱۳ء

انوار صدیقی امروہوی صاحب آداب!

آپ کا خط موصول ہوا۔ ”نسخہ قاطع برہان بہ خط غالب امروہہ میں“ میں پہلے ہی پڑھ چکا تھا۔ آپ نے غالب کی تحریروں کی املائی خصوصیات کی تفصیل کو بڑی محنت اور لگن سے بیان کیا ہے۔

آپ کے خط کا جواب دینے میں مجھے تاخیر اس لئے ہوئی کہ میں چاہتا تھا کہ ”قاطع برہان“ کے اس نسخے کی تحریر کو ”غالب کے خطوط“ میں شائع ہونے والے خطوط کے عکس سے موازنہ کر سکوں۔ پانچ جلدوں میں، جو میں نے غالب کے خطوط مرتب کئے ہیں۔ ان میں غالب کے کئی خطوط کے عکس شامل ہیں۔ چونکہ میں نے مکان تبدیل کر دیا تھا۔ اس لیے یہ میری کتاب بڑی مشکل سے دستیاب ہوئی۔ تین چار دن پہلے ہی مجھے غالب کے خطوط کا وہ نسخہ ملا جو میں نے مرتب کیا تھا۔ میں نے غالب کے خطوط کے عکس سے ”نسخہ قاطع برہان بہ خط غالب امروہہ میں“ غالب کی تحریر کا موازنہ کیا۔ مجھے خوشی ہے کہ آپ نے اپنے مضمون میں غالب کی جو املائی خصوصیات بیان کی ہیں وہ بالکل درست ہیں۔ اور میں یقین کے ساتھ کہہ سکتا ہوں کہ آپ نے مجھے ”نسخہ قاطع برہان“ کا جو عکس بھیجا ہے وہ بالکل GENUINE ہے۔

آپ مجھ سے بہت چھوٹے ہیں اور میرے بھائی توفیق احمد قادری صاحب کے صاحبزادے ہیں، اس لیے میں آپ کو مشورہ دوں گا کہ ”نسخہ قاطع برہان“ کو بہت عام نہ کیجئے۔ آپ کو بیاض غالب کا پورا قصہ معلوم ہی ہے۔ کوئی بھی شخص آپ کے یہ نسخہ قاطع برہان بہ خط غالب امروہہ بہ آسانی شائع کر سکتا ہے۔ جو آپ کے حق میں مفید نہ ہوگا۔

امید ہے کہ آپ بہ خیریت ہوں گے۔

نیاز کیش

خلیق انجم

زیر نظر ”قاطع برہان بخط غالب نسخہ توفیقیہ“ کے شروع اور آخری اوراق ملاحظہ فرمائیں:

یہ نسخہ محمد عبداللہ بن مرتضیٰ کے ملک میں رہا ہے جیسا کہ سرورق پر تحریر ہے۔ ”مالکہ محمد عبداللہ بن مرتضیٰ عفا اللہ عنہما“ ممکن ہے کہ محمد عبداللہ یا جناب مرتضیٰ غالب کے احباب میں سے ہوں۔ کیوں کہ عبداللہ کا ذکر غالب کے حوالہ سے کافی مشہور ہے کہ انھوں نے قاطع برہان کا رد لکھا تھا۔ (بحوالہ اردوئے معلیٰ دہلی کا غالب نمبر حصہ سوم، فروری ۱۹۶۹ء صفحہ ۶۶۲ تا ۶۶۶)

کیفیت نسخہ: اوراق: ۲۰۱ = صفحات: ۴۰۲، زبان: فارسی، خط: بخط غالب، مسطر:

۱۱ سطر، روشنائی: سیاہ۔ برائے متن، شگرفی۔ برائے سرخی، کاغذ: مہری (جس کا رخانہ یا شہر میں یہ کاغذ بنا ہے وہاں کا مونوگرام دو مینارا اور ایک گنبد اس نسخے کے کاغذ پر بنے ہوئے ہیں۔)

سائز کاغذ: 19.5x12cm سائز متن: 14.5x7cm

لائق صدا احترام قاضی عبدالودود صاحب نے قاطع برہان کا نسخہ مرتب کیا اور اس کو ادارہ تحقیقات اردو پٹنہ نے ۱۹۶۷ء میں شائع کیا تھا لیکن قاضی صاحب نے یہ نہیں بتایا کہ ان کے پیش نظر کون کون سے خطی اور مطبوعہ نسخے رہے اور نہ ہی یہ نشاندہی کی کہ قاطع برہان کے خطی نسخے کہاں کہاں موجود ہیں!

یاد رہے کہ ۱۵ اپریل ۱۹۶۹ء ”نسخہ دیوان غالب بخط غالب“ میرے والد صاحب مدظلہ العالی نے بھوپال سے دریافت کیا تھا۔ جو آج بھی رام پور کے مولانا عرشی کے خاندان کے پاس ناجائز طریقہ سے رکھا ہے۔ نیز اس کی درد بھری داستان دنیا کے علمی و ادبی رسائل و جرائد اور کتب وغیرہ میں موجود ہے۔

فقط

انوار صدیقی امر و ہوی

صدی تقریب

کاشانہ ادب، سکھا دیوراج،

پوسٹ بسوریا، وایالوریا،

مغربی چپارن (بہار)

۸۴۵۴۵۳

۱۳/۷/۹ء

محترمی! زید مجدکم السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

معارف مئی اور جون ۱۳ء کے شمارے ایک ساتھ موصول ہوئے۔ یہ جان کر خوشی ہوئی کہ دارالمصنفین کی تاسیس اور علامہ شبلی کی رحلت پر پورے سو سال گزرنے والے ہیں۔ ان دونوں اہم واقعات کے مد نظر دارالمصنفین کے ارباب حل و عقد نے صدی تقریبات کے انعقاد کا فیصلہ کیا ہے۔

دارالمصنفین کے لیے یہ نہایت ہی مسرت کی بات ہے کہ اس کے قیام کے روز اولین سے اس کی باگ ڈور ایسے مخلص اور ایثار پسند علماء کے ہاتھوں میں رہی جو اپنے زمانے کے ممتاز اہل قلم اور مصنفین تھے۔ اور آج بھی (بجملہ اللہ) اس کے ذمہ دارانہیں اوصاف کے حامل ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ یہ ادارہ تقریباً ایک صدی سے پوری کامیابی کے ساتھ علمی و دینی خدمات انجام دینے ہی میں مصروف عمل ہے اور اس کی تصنیفات و تالیفات، ہندوپاک ہی نہیں بلکہ عرب اور یورپ میں بھی قابل استناد سمجھی جاتی ہیں۔

دارالمصنفین کی خدمات اور اس کے موقر رسالہ معارف کے بارے میں علامہ اقبالؒ، مولانا ابوالکلام آزادؒ، ڈاکٹر حمید اللہ (پیرس) اور ڈاکٹر ذاکر حسین مرحوم (سابق صدر جمہوریہ ہند) وغیرہم کی آراء سے اہل علم واقف ہیں۔

اپنے زمانہ کے ممتاز عالم مولانا قاضی مجاہد الاسلام قاسمیؒ (۱۹۳۶ء-۲۰۰۲ء) نے ایک بار ناچیز سے فرمایا تھا:

”دارالعلوم دیوبند سے فراغت کے بعد جب بحیثیت معلم میرا تقرر جامعہ رحمانی مونگیر ہو گیا تو میں نے دارالمصنفین (اعظم گڑھ) کی تصنیفات و تالیفات کا بالاستیعاب مطالعہ کیا۔ میری تحریری اور تقریری صلاحیت جو کچھ بھی ہے وہ دارالمصنفین کی کتابوں کی رہن منت ہے۔“

ماہر القادری مرحوم (ولادت ۱۳۲۲ھ- وفات ۱۹۷۸ء) نے ایک جگہ لکھا ہے کہ میرے اندر تنقیدی صلاحیت علامہ شبلی نعمانیؒ کی شعر الجم اور موازنہ انیس و دبیر کے مطالعے سے پیدا ہوئی۔ انہوں نے ایک مکتوب میں ناچیز کو مذکورہ کتابوں کو بار بار مطالعہ کرنے کا مشورہ دیا تھا۔ افسوس ہے کہ ان کا وہ مکتوب میرے پاس محفوظ نہیں ہے۔

استاذ محترم مولانا سید نظام الدین مدظلہ (امیر شریعت بہار، اڑیسہ و جھارکھنڈ) نے میرے طالب علمی کے زمانے میں مجھ سے کئی بار فرمایا:

”علامہ شبلیؒ کی سیرت النبیؐ کی تمام جلدیں بالاستیعاب پڑھ جاؤ۔ وہ مولوی نہیں جس نے سیرت النبیؐ کا مطالعہ نہیں کیا۔“

جس ادارے کی علمی و دینی خدمات کا اعتراف اپنے اپنے زمانے کے ممتاز علماء کریں اور جس کی تصنیفات و تالیفات سکہ رائج الوقت کی حیثیت رکھتی ہوں، اس ادارے کے کارناموں کے اعتراف میں صدی تقریبات کے انعقاد کا فیصلہ قابل صد تحسین ہے۔ انشاء اللہ دارالمصنفین کے ذمہ داروں کی مخلصانہ کوششوں سے اس کا جشن صد سالہ ہر طرح کامیاب رہے گا۔

بڑا اچھا ہو کہ صدی تقریبات کے موقع پر اشاریہ معارف کی بقیہ دونوں جلدیں بھی منظر عام پر آجائیں۔ اشاریہ کے فاضل مرتب ڈاکٹر جمشید ندوی صاحب کو اس کی طرف خصوصی توجہ دینی چاہیے۔

والسلام، نیازمند

وارث ریاضی

راجہ رتن سنگھ زخمی اور قصیدہ ہفت بند.....

اسٹنٹ پروفیسر شعبہ فارسی

جی سی یونیورسٹی لاہور، پاکستان

مدیر محترم معارف

سلام مسنون!

آپ کا موقر جریدہ ”معارف“ شمارہ جون ۲۰۱۳ء نظر سے گذرا۔ یہ علمی اور ادبی مجلہ تشنگان علم کے لیے ایک ساغر کی حیثیت رکھتا ہے کہ اس میں موجود بادۂ معانی مجھ ایسے ہچمدان کے لیے تسکین کامل کا باعث ہے۔ فارسی ادبیات کا طالب علم ہونے کی حیثیت سے اس شمارے میں ڈاکٹر سید لطیف حسین ادیب کا مضمون ”راجہ رتن سنگھ زخمی اور قصیدہ ہفت بند در منقبت شیر خدا امیر المومنین حضرت مولیٰ علی کرم اللہ وجہہ“ خصوصی توجہ کا مرکز بنا۔ بندہ جی سی یونیورسٹی لاہور میں راجہ رتن سنگھ زخمی کے دیوان کی تدوین و تصحیح کے موضوع پر پی ایچ ڈی اسکالرشپ ہے اور جولائی ۲۰۱۳ء مقالے کی تکمیل کا مہینہ ہے۔ مجھے پنجاب یونیورسٹی لاہور سے اس دیوان کے دو خطی نسخے ملے۔ ان میں ایک خطی نسخے میں رتن سنگھ زخمی کا مذکورہ ہفت بند دیوان غزلیات کے شروع میں موجود ہے لیکن اس کے بعض اشعار کرم خوردہ ہونے کی وجہ سے ناخوانا ہیں۔

میں آپ کے اس جریدے اور خصوصاً ڈاکٹر سید لطیف حسین ادیب کا تہ دل سے ممنون ہوں کہ اس مضمون کی اشاعت سے مجھے اس ہفت بند کی تصحیح میں قدرے مدد ملی۔ بعض ناخوانا اشعار کی اس مضمون کی مدد سے تصحیح کی گئی لیکن ابھی تشنگی باقی ہے۔ میری استدعا ہے کہ ازراہ کرم ماہ جولائی یا اگست کے شمارے میں اس ہفت بند کو چھاپ دیا جائے تو یہ آپ کی طرف سے ایک عظیم علمی خدمت ہوگی۔

ممنون احسان

بابر نسیم آسی

جہان شبلی

۵۸، نیو آزاد پورم کالونی،
چھاؤنی اشرف خان، عزت نگر،
بریلی۔ ۲۴۳۱۲۲
۱۳/۷/۱۷ء

برادر مکرّم
سلام مسنون
مزاج گرامی!

آج کی ڈاک سے معارف کا تازہ شمارہ موصول ہوا۔ جہان شبلی کی اشاعت کا شکریہ۔ میں نے یہ مضمون اسکیڈنگ کرا کے ای میل کے ذریعے آپ کو ارسال کیا تھا۔ اسکیڈنگ میں اکثر صفحے کی آخری سطر مدہم یا حذف ہو جاتی ہے، اس مضمون کے ساتھ بھی یہی ہوا۔ تین مقامات پر عبارتیں چھوٹ گئی ہیں جس سے مضمون کا تسلسل ٹوٹ گیا ہے، وہ مقامات یہ ہیں:

صفحہ ۴۲، سطر۔ ”قبول کر لیا تھا“ کے بعد یہ عبارت چھوٹ گئی۔ ”اردو اخبارات نے اسے ایک خوش آئند خبر کے طور پر درج کیا۔ بدایوں سے شائع ہونے والا ہفتہ وار ذوالقرنین نے“.....
صفحہ ۴۳، سطر ۱۴ کے بعد نمبر (۶) کا اندراج اور یہ عبارت ”نظامی بدایونی نے اپنی تالیف قاموس المشاہیر ج ۲ (بدایوں ۱۹۲۶) میں مولانا شبلی کا ترجمہ دیا ہے، ترجمہ حسب ذیل ہے“.....
صفحہ ۴۵، سطر ۲، ”مسکت جواب ہے“ کے بعد یہ عبارت چھوٹ گئی۔ ”کیونکہ ان دونوں

عبارتوں کا زمانہ تحریر ۱۹۲۶ء ہے۔“

اس کے علاوہ صفحہ ۴۷ سطر ۶ میں اضطراب و بدحواسی کی جگہ اضطراب و حواسی درج ہو گیا ہے۔ قارئین ان مقامات کی تصحیح فرمائیں۔

صفحہ ۴۷ پر شق نمبر ۸ کے تحت جو پہلا خط بہ نام وقار الملک نقل ہوا ہے۔ اس کا صرف عکس شائع کرنا مقصود تھا۔ راقم الحروف کی غلطی سے وہ غیر مطبوعہ خطوط میں شامل ہو گیا۔ اطلاعاً عرض ہے کہ یہ خط نقوش مکاتیب نمبر لاہور (ص ۱۸۹) باقیات شبلی (۲۰۴) مکتوبات شبلی (۳۹) میں شامل ہے۔ شمس بدایونی

صدی تقریب

گلشن عتیق، مسجد عمر بن خطاب،

نیو عظیم آباد کالونی، سنچر باغ،

مہیندرو، پٹنہ (بہار) ۸۰۰۰۰۶

۱۱ جولائی ۱۳ء

بحمد للہ آج رمضان المبارک کی پہلی تاریخ ہے۔ آپ کو بہت بہت مبارک ہو۔

میں دو ماہ تک دہلی میں رہا اور علیل رہا، اس لیے معارف کے حالیہ شماروں کے دیدار سے محروم رہا، اب جبکہ وہاں سے گھر واپس آ چکا ہوں، اپریل، مئی، جون کے شمارے میرے سامنے ہیں، انہیں کے شذرات، اخبار علمیہ، مقالات اور دیگر علمی و ادبی مباحث کے مطالعہ میں مصروف ہوں۔ بڑا لطف آتا ہے، علمی تشنگی بجھتی ہے اور بھڑکتی بھی ہے، حقیقت یہ ہے کہ دارالمصنفین کی دیگر تصنیفی خدمات کو الگ کر کے دیکھا جائے تو صرف معارف قریب سو سال سے علمی، دینی، تحقیقی، ادبی میدان میں ایسی خدمات انجام دے رہا ہے، جس کی مثال اردو کیا فارسی و عربی زبان میں بھی بڑی مشکل سے ملے گی، بلکہ اگر بے مثال کہوں تو بے جا نہ ہوگا، ایسے اہم ادارے کی صدی تقریب ضرور منائی جانی چاہیے، جیسا کہ میرے بزرگ دوست پروفیسر اشتیاق احمد ظلی صاحب نے ایک جگہ شذرات میں اس کی طرف اشارہ کیا ہے۔ اس سلسلے میں میرے لائق جب اور جو خدمت ہو آپ بلا تکلف ہدایت فرمائیں، میرے لیے سعادت کی بات ہوگی۔

میرے پاس مولانا عبدالماجد دریابادی اور شاہ معین الدین احمد ندوی کے تقریباً ۳۰، ۳۵ خطوط محفوظ ہیں۔ اگر آپ اجازت دیں تو چند اہم خطوط مضمون کی صورت میں مرتب کر کے معارف کے لیے بھیج دوں تاکہ یہ محفوظ ہو جائیں اور علمی دنیا ان سے واقف ہو۔

میری ایک تازہ تصنیف ”عرب و ہند کی علمی و ادبی خدمات“ کے نام سے چھپی ہے، اس کی دو کاپی معارف میں تبصرہ کے لیے بھیج رہا ہوں۔

والسلام
عتیق الرحمن

”نقوش رفتہ“

۱۵ جولائی ۲۰۱۳ء

مکرمی و محترمی! السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

مزاج بخیر ہوں۔ اتفاق سے مئی، جون دو ماہ سے کچھ اوپر لکھنؤ سے باہر رہا۔ بیٹا رشید اطہر کے پاس دوحہ (قطر) ایک ماہ رہا اور کچھ وقت بمبئی میں گزرا۔ واپس آ کر حیدرآباد چلا گیا جہاں خاندان میں ایک تقریب میں شرکت ضروری تھی۔ ۴ جولائی کو واپس آنے پر آپ کی حوصلہ افزا تحریر معارف (مئی شمارہ) میں کتاب ”نقوش رفتہ“ پر پڑھ کر خوشی ہوئی۔ آپ نے کچھ غلطیوں کی نشان دہی کی ہیں، جن کے لیے شکر گزار ہوں۔ پروف ریڈنگ میں عجلت کے سبب یہ غلطیاں رہ گئیں جنہیں انشاء اللہ درست کر دی جائیں گی۔

وہ پیڑھی جس نے آزادی سے قبل و بعد کے آئے انقلابات کو نہ صرف دیکھا بلکہ وقت کی تیز و تند اور ناروا گرم ہواؤں کا پوری قوت سے مقابلہ کیا، ان وقتوں کے لوگ اور ان کی فکر و کار نامے قابل ستائش ہیں۔ جنہیں دیکھا اور ان کی قربت کا شرف حاصل ہوا اور نوازشات سے بہرہ ور ہوا، انہیں پر اپنی کم مانگی کے باوجود لکھنے کی جسارت کی۔

آپ اور جملہ اراکین دارالمصنفین کو اللہ رمضان المبارک کی برکتوں سے نوازے۔ اب انشاء اللہ اکتوبر تک ارادہ ہے دارالمصنفین کی زیارت کا۔ دعاؤں کا طالب۔ مخلص

شاہد عمادی

ادبیات

آؤ دعا کریں

فآخر جلال پوری

ففتنوں کا کاروبار ہے آؤ دعا کریں
 تہذیب، رکھ رکھاؤ اور آداب زندگی
 موج نسیم، باد صبا کے لیے بھی اب
 اک حق پرست عام نگاہوں میں ان دنوں
 ہر ہر قدم پہ گلیوں میں اور شاہراہ پر
 اکثر خطیب شہر کا ارشاد عالیہ
 افسوس صرف لقمہ ترکی ہوس میں آج
 مال و متاع، جاہ و حشم کا بس اک جنوں
 اپنا ضمیر بیچنے والا ہی آج کل
 مکر و فریب اور ریا کاریوں کا شغل
 دھرتی پہ رہ کے کرتے ہیں بات آسمان کی
 اللہ رے حقوق و فرائض کا ہر عمل

ہر سواک انتشار ہے آؤ دعا کریں
 نسلوں پہ جیسے بار ہے آؤ دعا کریں
 ہر پھول جیسے خار ہے آؤ دعا کریں
 جیسے گناہ گار ہے آؤ دعا کریں
 تہذیب شرمسار ہے آؤ دعا کریں
 لفظوں کا اک حصار ہے آؤ دعا کریں
 انساں ذلیل و خوار ہے آؤ دعا کریں
 اعصاب پہ سوار ہے آؤ دعا کریں
 لوگوں میں ذی وقار ہے آؤ دعا کریں
 اب وجہ افتخار ہے آؤ دعا کریں
 یوں زیست سے فرار ہے آؤ دعا کریں
 اک دوسرے پہ بار ہے آؤ دعا کریں

فآخر انا کی پیاس بجھانے کے واسطے

ہر شخص بے قرار ہے آؤ دعا کریں

مطبوعات جدیدہ

فتاویٰ دارالعلوم دیوبند (جلد ۱۳، ۱۴): افادات مولانا مفتی عزیز الرحمن عثمانیؒ،

مرتب مفتی محمد امین پالن پوری، متوسط سے قدرے بڑی تقطیع، عمدہ کاغذ و طباعت، مجلد،

صفحات بالترتیب ۵۱۲، ۵۴۴، قیمت درج نہیں، پتہ: مکتبہ دارالعلوم دیوبند، یو پی ۵۵۴۵۵۴۔

دیوبند کا دارالعلوم ایک شجرہ طیبہ ہے جس کی جڑوں کی مضبوطی نے اس کی ہر شاخ کو برگ آوروں پر بار بنا دیا، اس کا شعبہ افتاء بھی اسی حقیقت کی ایک مثال ہے، ہند بیرون ہند کے بے شمار مذہبی و ملی مسائل میں دیوبند نے اب تک مسلسل رہنمائی کا جو فریضہ انجام دیا وہ واقعی لائق فخر ہے، عام مسلمانوں کا یہ امتیاز و اعتماد اگر قائم ہوا تو اس کی وجہ بھی ہے کہ دیوبند کی مسند افتاء پر ایسے علماء متکلم ہوتے جن کو علم و فضل کے ساتھ امانت و دیانت اور معاملہ فہمی کی صلاحیت و دیعت ہوتی رہی، مفتی عزیز الرحمن عثمانیؒ اسی صاحب علم و فہم طبقہ کے سرخیل یعنی مفتی اول ہیں، فتاویٰ یا مرتبین کی تعبیر میں ارشادات ہمارے پیش نظر ہیں، اس سے پہلے بارہ جلدیں، ارکان اسلام اور نکاح و طلاق قصاص و حدود جیسے موضوعات پر مشتمل ہیں، پیش نظر جلدوں میں ترکہ و تجارت میں ہٹارے اور شرکت، مضاربہ، وقف، مساجد، قبرستان، خرید و فروخت، سود، جوا، بیمہ وغیرہ بے شمار مسائل آگئے ہیں، ان فتوؤں کا زمانہ قریب سو سال پہلے کا ہے، لیکن اکثر مسائل میں تازگی کا احساس ہوتا ہے، وجہ شاید یہ ہو کہ حضرت مفتی عثمانیؒ کا انداز بڑا حکیمانہ و دلنشین ہے، وہ مسئلہ کی اصل ماہیت سے واقف کراتے ہوئے مستفتی کے ذہن اور معاملہ کے پس منظر کی واقعیت کو نظر میں رکھتے تھے، مثلاً ایک سوال پوچھا گیا کہ جو شخص جاہل ہو اور صوم و صلاۃ کا پابند نہ ہو اس کو متولی مسجد یا مہتمم مدرسہ مقرر کرنا درست ہے یا نہیں؟ جواب کا انداز ملاحظہ ہو کہ ”متولی ایسے شخص کو بنانا چاہیے جو خائن نہ ہو اور کار تولیت اچھی طرح انجام دے سکے، اس قدر تو ضروری ہے اور بہتر یہ ہے کہ نیک آدمی کو جو کہ پابند احکام شریعت ہو اور تولیت کا کام بھی انجام دے سکے، متولی بنایا جائے۔“ بعض مسائل سے وقت کے تغیر و تبدل کے اثرات کا اندازہ ہوتا ہے، مثلاً فونو گراف کے ذریعہ نعتیہ مضامین اور قرآن مجید سننے کے متعلق کہا گیا کہ یہ ایک باجا ہے اس میں کچھ سننا درست نہیں، اسی

طرح کہیں کہیں زبان کا بھی معاملہ ہے جیسے ایک جگہ یہ عبارت کہ ”جائز ہے بہ شریک وہ سائل تخطی رقاب نہ کرتا ہو“۔ ان بیش قیمت فتاویٰ کے مسودات کس طرح مبیضوں میں لائے گئے، تصحیح اور حوالوں کی تخریج کیسے کی گئی اور کن حضرات کی توجہ سے یہ قیمتی سرمایہ آج طباعت کی حفاظت میں آیا یہ ساری تفصیلات فاضل مرتب کے قلم سے آگئی ہیں، تعلیقات و حواشی بھی بڑے کام کے ہیں، سماع موتی کے اقرار و انکار کی بحث میں مولانا نانوتوی کی یہ تطبیق بر محل پیش کی گئی کہ اسماع ممکن نہیں سماع ممکن ہے۔ ایک جگہ ملا جیون کے وطن اٹیٹھی کورائے بریلی کا معروف قصبہ بتایا گیا ہے، یہ تسامح ہے ملا جیون کا اٹیٹھی رائے بریلی والا نہیں، اناؤ والا ہے۔

نقوش جاوداں: از پروفیسر کبیر احمد جانی مرحوم، تقدیم و ترتیب از ڈاکٹر شہاب الدین، متوسط تقطیع، عمدہ کاغذ و طباعت، مجلد، صفحات ۱۹۲، قیمت ۲۸۰ روپے، پتہ: ایجوکیشنل بک ہاؤس مسلم یونیورسٹی مارکیٹ، علی گڑھ اور منو، سرانے میر اور اعظم گڑھ کے ملکتے۔

علی گڑھ سے تعلق رکھنے والی گیارہ ہستیاں یا پھر اس دانش کدہ کے آسمان پر رقصاں و فروزاں گیارہ ستارے یا سیارے جن کے متعلق فاضل مصنف کے تاثرات اس جزم کے ساتھ ہیں کہ رأیت احد عشر کوکبا۔ پروفیسر عبدالعلیم، آرزو صاحب، پروفیسر شمیم بے راج پوری، ذاکر علی خاں، ابن فرید، اسرار احمد، حبیب خان، حافظ غلام مصطفیٰ، سید امین اشرف، ڈاکٹر اخلاق احمد اور ایک وہ جو اپنے مذاق طرب آگیاں کا شکار ہوئے یعنی انور صدیقی جو پوری، ان میں سے کچھ زندہ ہیں اور کچھ وہ ہیں جو غروب کے بعد بھی تابندہ ہیں، زندگی اور موت سے پرے ان سب میں ایک رشتہ یعنی علی گڑھ کا رشتہ، مشترک ہے، جانی صاحب بقول فاضل مرتب علی گڑھ کے پیکر میں ڈھلتے تھے، اس لیے علی گڑھ کے آسمانوں میں خیالوں کی پرواز کے لیے کندہم جنس باہم جنس پرواز کی شرط پر پورے تھے، ہوا بھی یہی وہ پروفیسر عبدالعلیم ہوں یا بابا امین اشرف، جانی صاحب کی مرقع آرائی نے ہر شبیہ کو دیکھنے ہی کے نہیں دل میں اتر جانے کے لائق بنادیا، مقدمہ میں سوانح نگاری، تذکرہ نگاری، خاکہ نگاری وغیرہ پر فضلاء نے بحث کر کے ان مرقعوں کو خاکوں سے تعبیر کیا گیا ہے یہ خاکے نہ بھی ہوں لیکن لکھنے والے نے جس طرح ان کو دیکھا، پایا، پرکھا، اس کا بے ساختہ اور برجستہ، سچا اور سادا اظہار واقعی خاک کے پتلوں کو نورانی ضرور بنا دیتا ہے،

کہیں شوخی اور کہیں محبت آمیز طنزیہ جملوں کی موجودگی، علی گڑھ کے مخصوص اور مستقل خانگی ماحول کو اور زیادہ توجہ کے لائق بنا جاتی ہے، کیسے کیسے جملے ”سرسید کے عہد حیات سے آج تک سرسید کے مخالفین کف درد ہاں ہوئے، سرسید زندگی بھر اپنے مخالفین کو جوابات دے کر اپنی برتری ثابت کرتے رہے، ان کے بعد ان کے اخلاف معنوی ان کی سنت کو برقرار رکھے ہوئے ہیں، سرسید کے بعد جن لوگوں کے ہاتھوں میں ایم اے او کالج اور مسلم یونیورسٹی رہی وہ بھی برتری کے خناس میں دست و گریباں ہے۔ وقار الملک اور حضرات کو (؟) کو مٹھ کا درجہ حاصل تھا، بقیہ مشمت خاک کی تعداد گھٹتی بڑھتی رہی یہ ”حشرات الارض“ کی طرح کبھی ادھر تو کبھی ادھر ”جلوہ فرما“ ہوتے۔“

پروفیسر عبدالعلیم کے ذکر میں بقول جانشی صاحب یہ تمہید ناگزیر تھی لیکن حقیقت یہی ہے کہ بقیہ ہستیوں کے ذکر میں بھی یہ فکر کام آنے والی ہے، جانشی صاحب کی ایک بڑی خوبی یہ بھی ہے کہ وہ جس کے متعلق جو رائے قائم کرتے اسے اندیشہ سود و زیاں سے بے نیاز ہو کر کہہ گذرتے، شروع میں ایک محترم ناقد کی یہ رائے علاحدہ اور نمایاں پیش کی گئی ہے کہ کبیر صاحب کا اسلوب ٹھنڈا اور جارحیت سے بالکل عاری ہے، ہماری نظر میں جارحیت اگر نہیں تو یہ جراحیت سے خالی بھی نہیں۔ یہ اور بات ہے کہ جراحیت کا عمل حالت جذب کا مرہون ہو، جیسے ایک جگہ انہوں نے علی گڑھ کے سمسٹر سسٹم کو جہل افروز بتایا اور طلبہ اور اساتذہ کی غیر سنجیدگی کو معیار تعلیم کے پست تر ہونے کی وجہ بتاتے ہوئے اچانک محسوس کیا کہ ”میں عالم جذب میں کہاں سے کہاں نکل آیا“ مختار الدین آرزو پر ان کی تحریر بھی شاید اسی عالم جذب کی ہے جس میں انہوں نے بعض مفروضات کی عمارتیں اپنی طبعی شرافت اور پاس ناموس کی قوت سے ڈھادیں۔ بات میں بات نکالنے کی معصومانہ ادایا تو مولانا گیلانی کے اسلوب کی خاصیت تھی یا پھر اس کا لطف جانشی صاحب کی تحریروں میں آتا ہے۔ خوب ہوا جوان تحریروں کو ان کے سعادت مند اور لائق شاگرد نے سمیٹ کر شائع کر دیا، البتہ ”حاسوبی کتابت“ پر ذرا اور توجہ کی ضرورت تھی، نچلے نہ بیٹھے کو نہ چلے نہ بیٹھے لکھنا اور شپرہ چشموں کو شب پردہ چشموں لکھنا، ظلم کے سوا اور کیا ہے۔

رسید کتب

- ۱- آزادی کے بعد اردو میں عربی ادب کے جائزے: ڈاکٹر محمد شارق، ادبستان پبلی کیشنز، A-170 گراؤنڈ فلور، سوریا پارٹمنٹ، دلشاد کالونی، دہلی - قیمت: ۳۳۰ روپے
- ۲- اسلامی علوم کا ارتقاء عہد سلطنت کے ہندوستان میں: پروفیسر ظفر الاسلام اصلاحی، اسلامک بک فاؤنڈیشن ۸۱، حوض سویوالان، نئی دہلی - قیمت: ۱۲۰ روپے
- ۳- انفرادیت کی تلاش: ڈاکٹر آفاق فاخری، مجلہ قاضی پورہ، جلال پور، امبیڈکر نگر - قیمت: ۱۲۰ روپے
- ۴- دارالمصنفین کی عربی خدمات: ڈاکٹر محمد عارف اعظمی عمری، ادبی دائرہ، عقب آواس وکاس کالونی، اعظم گڑھ - قیمت: ۳۰۰ روپے
- ۵- رقص غبار (شعری مجموعہ): ڈاکٹر کلب حسن حزیں، سکراول ٹائڈہ، امبیڈکر نگر، یوپی - قیمت: ۱۰۰ روپے
- ۶- عمر عائشہؓ پر ایک نظر: علامہ قاری حافظ حبیب الرحمن صدیقی کاندھلوی، عبدالرحمن ادیب، ۱۶۳، ملتانیان، کیرانہ، مظفر نگر، یوپی - قیمت: ۳۰ روپے
- ۷- لالہ صحرائی: حنیف ترین، ۷۱-۴۰/۲۳، گڑگاؤں، ہریانہ - قیمت: ۲۰۰ روپے
- ۸- سلطان المشائخ حضرت خواجہ نظام الدین اولیاء محبوب الہی: مولانا ڈاکٹر محمد عاصم اعظمی، کمال بک ڈپو، مدرسہ شمس العلوم، گھوسی، ضلع منو - قیمت: ۴۱۶ روپے
- ۹- محمد ایوب واقف - ایک مطالعہ: ڈاکٹر سینی سروجنی، محمد ایوب واقف، سی کون ایوینو، بی بلڈنگ، فلیٹ نمبر ۵، ساتواں فلور، سیکٹر نمبر ۱۴، کپور تھیرہ، نیومہی - قیمت: ۱۵۰ روپے
- ۱۰- ناگپور سیاسی تاریخ کے تناظر میں: ڈاکٹر محمد شرف الدین ساحل، ساحل کمپیوٹرس حیدری روڈ، مومن پورہ، ناگپور، مہاراشٹر - قیمت: ۱۲۵ روپے
- ۱۱- نظام تعلیم و تربیت، اندیشے، تقاضے اور حل: محمد واضح رشید حسنی ندوی، مجلس تحقیقات نشریات اسلام، لکھنؤ - قیمت: ۱۰۰ روپے